اخوانی شیعیت

1979ء کے ایرانی انقلاب کی فکری اور سماجی بنیاد

مؤلف:
ابو دعبل خزاعی

نام کتاب	:	اخوانی شیعیت
مؤلف	:	ابودعبل خزاعی
کمپوزنگ	:	سید وسیم حیدر نقوی، ملتان
معاونت	:	جملہ علماء و مترجمین بورڈ مرکز ولایتِ علیؑ، سندھ، پاکستان
رابطہ	:	مرکزی سیکرٹریٹ مرکزِ ولایتِ علیؑ، سندھ، پاکستان

سادات اسٹریٹ پاکستان چوک، لاڑکانہ، سندھ

علامہ سفیر حسین کربلائی

0333-7517110

علامہ سید ساجد حسین نقوی

0315-1336699

علامہ سید ذکی رضوی

0331-3554668

ملنے کا پتہ:

مرکزی سیکرٹریٹ مرکزِ ولایتِ علیؑ سادات اسٹریٹ پاکستان چوک لاڑکانہ، سندھ، پاکستان

mwap-sindh

mwap-sindh

mwap-sindh

www.mwap-sindh.com

E-mail mwap.sindh.177@gmail.com

ارشادِ الٰہی

سورۂ توبہ کی آیت 31 میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا﴾۔

ترجمہ:

"انہوں نے اپنے مولویوں اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنالیا۔"

"ابو بصیر سے مروی ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے اس آیت، "انہوں نے اپنے مولویوں اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنالیا" کے بارے میں پوچھا۔ آپؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! انہوں نے اپنی کی عبادت کی طرف ان کو نہیں بلایا تھا، اور اگر ایسا کرتے تو وہ لوگ ان کی بات نہ مانتے، بلکہ انہوں نے ان کے لئے حرام کو حلال کردیا تھا اور حلال کو حرام، اور ان کو اس کی خبر نہ ہوئی"۔ [1]

سورۂ توبہ ہی کی آیت 34 میں آیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ

[1]۔ اصول کافی، کتاب ایمان وکفر، باب شرک، حدیث 7۔

سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾۔

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اکثر مذہبی علماء اور راہب (نام نہاد عارف اور صوفی) ناحق لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور انہیں راہِ خدا سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔“

فہرست

i	ارشادِ الٰہی	3
ii	مقدمہ	7
	اخوانی شیعیت	13
i	ولایتِ فقیہ کی اصطلاح کے پرانے معنی	14
ii	ایشیاء کے پہلے جمہوری انقلاب سے پہلوی آمریت تک	16
iii	اخوانی شیعیت کا ظہور اور مرجعیت سے بغاوت	20
iv	تصوف کا شہسوار سیاست کے اکھاڑے میں	24
v	سرد جنگ میں مولانا مودودی اور سید قطب کا استعمال	25
vi	سید علی خامنہ ای پر سید قطب کے اثرات	27
vii	عراق ایران تنازعہ اور شطرنج کے پیادے	28
viii	ملا نراقی اور سید احمد بریلوی کے تجربے سے سبق نہ سیکھا گیا	30
ix	اربنائزیشن کے اثرات	32
x	اخوانی تصورِ وحدت: عدم برداشت اور مخالفین پر ظلم	34
xi	ایران کی موجودہ صورتِ حال	38

xii	عراق میں سیکولر جمہوریت	39
xiii	پاکستان کے لئے سبق	39
	ضمیمہ	43
	1۔ایران میں سودی معیشت کے خلاف فتاویٰ	45
i	بیانات	45
	2۔ملاراج یا مولویوں کی حکومت کیوں درست نہیں؟	49
	3۔آقائے سیستانی: جمہوریت کے نگہبان	65
i	عبوری دور کا آغاز	71
ii	عراق کی خودمختاری کی طرف سفر	88
iii	انتخابات اور ایک نیا آئین	103
iv	جمہوریت کے حق میں آقائے سیستانی کے فتاویٰ	135

مقدمہ

ایرانی دنیا کی پہلی بڑی سلطنت بنانے والی قوم ہیں۔ سائرس اور داریوش کی حکومتیں مصر سے پنجاب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ڈھائی ہزار سال پر محیط بادشاہت کی تاریخ کے امین ہیں۔ ایک کمزور لمحے پر یونانیوں سے ہار گئے لیکن سکندر کی وفات کے بعد پھر سنبھل گئے۔ ساسانی سلطنت کی شکل میں ان کی رومیوں سے جنگ جاری رہی۔ ساتویں صدی میں عربوں نے روند ڈالا۔ عرب قبول اسلام کے بعد متحد و منظم ہو گئے تھے۔ اس دفعہ ایرانی نہ صرف مغلوب و مفتوح ہوئے بلکہ اپنا قدیمی مذہب، مجوسیت، چھوڑ کر مسلمان بھی ہو گئے۔ عربی خلافت کے کمزور ہونے پر ترک خلافت لے اُڑے۔ سولہویں صدی عیسوی میں ایرانی صفوی حکمرانوں کے تحت پھر منظم ہوئے تو صفویوں نے ترکوں کی بالادستی کا توڑ شیعیت کے قبول میں دیکھا اور ایران کا سرکاری مذہب شیعیت کو قرار دے دیا گیا۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ شیعیت میں صوفیت در آئی۔ ساسانی سلطنت کے بانی بابک شہنشاہ کے بیٹے نے اپنے وارث ایرانی بادشاہوں کو یوں نصیحت کی:

> ”یہ جانو کہ بادشاہ اور مذہب جڑواں بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک کے پاس کوئی طاقت نہیں سوائے ساتھی کے ذریعے سے، کیوں کہ مذہب بادشاہ کی بنیاد ہے اور بادشاہت مذہب کی محافظ۔ بادشاہت کو اپنی

بنیاد کی جبکہ مذہب کو اپنے محافظ کی ضرورت ہے۔ جس کا کوئی محافظ نہ ہو وہ تباہ ہو جاتا ہے اور جن کی کوئی بنیاد نہ ہو وہ برباد ہو جاتے ہیں۔ میں تمہارے لئے جس چیز سے بہت ڈرتا ہوں وہ ہے لوگوں کا حملہ۔ مذہب کی تعلیمات پر غور کرو اور اس کی تشریحات اور سمجھ پر توجہ دو۔ تم بادشاہت کی شان وشوکت سے مغرور ہو جاؤ گے اور مذہب کے بارے اور اس کی تعلیمات کے بارے میں اس کی تشریحات اور اس کے فہم کے بارے میں تحقیری رویہ اختیار کرو گے۔ تب مذہبی قائدین میں سے جو کم مایہ لوگوں اور رعایا میں چھپے ہوئے ہوں گے، وہ جنہیں تم نے زک پہنچائی ہو گی، ڈرایا ہو گا، محکوم اور ذلیل کیا ہو گا، اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ جانو کہ ایک مذہب میں چھپا ہوا قائد اور ایک حکومت کا قائد کبھی ایک ساتھ ایک بادشاہت میں نہیں رہ سکتے سوائے اس کے کہ مذہبی قائد وہ سب کچھ جو بادشاہت میں ہے وہ غصب نہ کر لے۔ کیونکہ مذہب بنیاد ہے اور بادشاہ ستون، اور بنیاد کے آقا کے پاس ساری طاقت ہے بمقابلہ ستون کے آقا کی طاقت کے۔"

صفویوں نے اپنی سلطنت اسی بنیاد پر قائم کی۔ انہوں نے اردشیر کی نصیحت کو پیش نظر رکھا اور ترکوں کے غلبے سے بچنے کے لئے شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دے دیا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں صفویوں کے زوال کے بعد قاجاریوں کے دور میں اصولی شیعیت ریاست کے ایک متوازی ادارے کے طور پر قائم ہو گئی۔

امام عصرؑ کی غیبت کے بعد اخباری روایات رائج رہی تھیں لیکن قاجاری دور میں اخباری علماء کا قتل عام کر کے اس روایت کو عملی طور پر ختم کر دیا گیا۔ اصولی علماء ہی قاضی بننے لگے ۔ انہوں نے اپنے اختیارات لئے ولایتِ فقیہ کا تصور پیش کیا۔ تعلیم اور انصاف کا کام ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے مشورے سے بادشاہوں نے بعض غلط فیصلے بھی کئے۔

انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں ایران میں جمہوریت کی تحریک چلی۔ چوتھے قاجار بادشاہ ناصر الدین شاہ کو جمال الدین افغانی کے پیروکار مرزا رضا کرمانی نے اس وقت قتل کر دیا جب وہ یکم مئی 1896ء کو شاہ عبدالعظیمؒ کے مزار پر حاضری اور دعا مانگ رہا تھا۔ اس کے بیٹے مظفر الدین شاہ کو حکومت سنبھالتے ہی مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ سالانہ سرکاری اخراجات بہت زیادہ بڑھ چکے تھے۔ اپنے دور حکومت میں مظفر الدین شاہ نے معیشت میں کچھ اصلاحات کی کوشش کی۔ تاہم سابقہ دور میں اٹھائے گئے قرضوں نے اس کوشش کو ناکام بنایا۔ مراعات اور غیر ملکی مداخلت کے بارے میں تعلیم یافتہ اشرافیہ اور مذہبی رہنماؤں کے درمیان پھیلی تشویش کے نتیجے میں 1906ء میں عوام نے آئینی جمہوریت کے لئے احتجاج شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں شاہ نے اکتوبر 1906ء میں پارلیمنٹ (قومی مشاورتی اسمبلی) بنانے کی تجویز کو قبول کیا، جس کے ذریعے بادشاہ کی طاقت کو کم کر دیا گیا مگر اس منصب کو باقی رکھا گیا کیونکہ شاہ نے عوام کو آئین اور پارلیمنٹ بنانے کا حق دے دیا تھا۔ بادشاہ مظفر الدین شاہ نے اپنی موت سے کچھ دیر پہلے 1906ء میں بننے والے ایران کے پہلے آئین پر دستخط کئے۔ جس کے نتیجے میں قاجار شاہ کے اختیارات محدود کر

کے حکومت کا انتظام پارلیمنٹ کے سپرد کیا گیا۔اس تبدیلی کو اس وقت کے اصولی شیعہ مراجع یعنی آخوند خراسانی، مرزا حسین تہرانی اور مرزا عبداللہ مازندرانی کی مکمل حمایت حاصل تھی ۔اس سے ایران ایک جدید ریاست بن گیا اور جدید پارلیمنٹ، تعلیم، صحت، بینکنگ اور انتظامیہ کی داغ بیل ڈالی گئی ۔

مظفرالدین شاہ کی وفات کے بعد جب نئے بادشاہ محمد علی شاہ قاجار نے جمہوریت کو ختم کرنے اور فوجی اور غیر ملکی حمایت سے اپنی مطلق العنان حکومت دوبارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، تو شیخ فضل اللہ نوری نامی درباری مولوی نے اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔انہوں نے پارلیمنٹ کے ادارے کی بنیادوں کو نشانے پر رکھ لیا۔اس نے اپنے پیروکاروں کو ساتھ لے کر 21 جون 1907ء کو شاہ عبدالعظیمؒ کے مزار پر دھرنا شروع کر دیا جو 16 ستمبر 1907ء تک جاری رہا۔اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے کہا کہ فقہ میں جدید دور کے ہر سوال کا جواز پہلے سے موجود ہے۔اس نے کہا کہ جمہوری حکومت سائنس اور غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کی اجازت دے گی، جس کے نتیجے میں الحاد پھیلے گا۔اپنی باتوں کو ملک کے گوشہ وکنار تک پہنچانے کے لئے اس نے ایک پرنٹنگ پریس خریدا اور ایک اخبار "روزنامہ شیخ فضل اللہ" شروع کیا اور چھوٹے چھوٹے کتابچے شائع کئے ۔اس کا خیال تھا کہ حکمران خدا کے علاوہ کسی ادارے کے سامنے جواب دہ نہیں ہے اور لوگوں کو اختیارات کو محدود کرنے یا بادشاہ کے طرز عمل پر سوال اٹھانے کا کوئی حق نہیں ہے۔اس نے خواتین کی تعلیم کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ لڑکیوں کے سکول بدکاری کے اڈے ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ اس نے جدید

صنعت کے قیام کے لئے فنڈز مختص کرنے، جدید طرز حکمرانی، اقلیتوں کے لئے مساوی حقوق اور آزادیٔ صحافت کی بھی مخالفت کی۔نوری نے محمد علی شاہ قاجار کے ساتھ مل کر روسی فضائیہ کی مدد سے 1907 میں مجلس (پارلیمنٹ) کو برخاست کرکے بمباری کرائی اور متعدد افراد کے قتل کا جواز فراہم کیا۔اس کے بعد ایران میں خانہ جنگی ہوئی اور 16 جولائی 1909ء کو شاہ کو معزول کر دیا گیا اور جمہوریت بحال ہوئی۔نوری کو گرفتار کیا گیا، مقدمہ چلایا گیا اور بدعنوانی اور بغاوت کا مجرم ثابت ہونے پر ایک اصولی مجتہد شیخ ابراہیم زنجانی نے اسے سزائے موت کا حقدار قرار دیا۔تاہم نوری کی موت بعد میں ایسا خون آلود کرتہ ثابت ہوئی جو اخوانی شیعیت کا پرچم بن گیا۔

1917ء میں روس میں کمیونسٹ انقلاب آ گیا۔اس کا اثر یہ ہوا کہ ایرانی کمیونسٹوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ یہ لوگ مارکس کی فکر کو تو ٹھیک سے نہ سمجھے تھے، نہ ہی اس کی خامیوں سے آگاہ تھے،لیکن روسی پروپیگنڈے کے اثر میں آ کر رٹی رٹائی باتیں کرتے تھے۔انہوں نے فلسفہ دانی کا بہت شور مچایا۔ایران میں کمیونسٹ آئیڈیالوجی کی کتب ترجمہ ہونے لگیں۔ جنگ عظیم اول کے خاتمے کے بعد ایران میں پہلوی سلطنت قائم ہوئی اور جمہوریت کی حیثیت برائے نام رہ گئی۔ چونکہ ایران میں تیل اور گیس دریافت ہو چکے تھے لہٰذا اس دولت کو استعمال کرتے ہوئے پہلے پہلوی بادشاہ نے تیزی سے ایرانی معاشرے کو تبدیل کیا۔شہروں کی آبادی بڑھی اور شرح خواندگی میں بھی اضافہ ہوا۔دوسری جنگ عظیم کے بعد کمیونزم تیزی سے پھیلنے لگا تو دوسرے پہلوی بادشاہ نے جواب میں ایرانی تصوف کو فلسفے کی شکل میں پیش کرنے پر زور دیا۔ملا صدرا اور شیخ اشراق کے مردہ گھوڑوں میں

جان ڈالی گئی۔اس کے ساتھ ساتھ مصر سے اخوان المسلمون کا لٹریچر ترجمہ ہونے لگا۔ان تبدیلیوں کا نتیجہ نوری کے پیروکاروں کے اخوانی جتھے کی شکل میں طاقت ور ہو جانے کی صورت میں نکلا۔ 1979ء کا ایرانی انقلاب اسی نئی قسم کی شیعیت کا نتیجہ تھا۔

پاکستان کے چار کروڑ شیعہ اثناء عشریہ کے لئے 1979ء کا ایرانی انقلاب شروع سے ہی ایک معمہ رہا ہے۔چونکہ اکثریت فارسی سے نابلد ہے لہٰذا ایرانی انقلاب کی حقیقت سے بے خبر رہی۔اس انقلاب کے بارے میں معلومات کا ذریعہ وہ مولوی صاحبان رہے جن کی روٹی ایرانی حکومت کے دسترخوان سے وابستہ تھی۔ان کی تعلیمی قابلیت بھی اتنی نہ تھی کہ غیر جانبدار ہو کر اس کا مطالعہ کرتے اور عوام کے سامنے حقائق رکھتے۔ چنانچہ انہوں نے مجالس میں اہلبیتؑ کے ذکر کی جگہ اس انقلاب کے فضائل و معجزات گھڑ گھڑ کر سنانا شروع کیئے اور غلو کی حدیں پار کر دیں۔ بدلے میں ان کو انعامات ملے اور وہ جائیدادوں اور گاڑیوں کے مالک بن گئے۔جس کسی نے خوفِ خدا اور مودتِ اہلبیتؑ سے لبریز ہو کر سچ بولنا چاہا، اسے پراکسیز کے ذریعے دبا دیا گیا۔کہیں جھوٹے کیسز اور کہیں جبر و تشدد اور کہیں شہادتیں، یوں پاکستانی شیعیانِ حیدرِ کرارؑ کے عقائد اور جذبات کے ساتھ بدترین کھلواڑ ہوا۔مرکز ولایتِ علیؑ پاکستان سندھ ضروری معلومات کی کمی کو پورا کرنے کے لئے 1979ء کے ایرانی انقلاب کا حقیقی چہرہ عوام کے سامنے لا رہا ہے تاکہ شیعیان امامِ مظلومؑ کو حقائق سمجھنے اور ان سے سبق حاصل کرنے میں مدد مل سکے۔

ابو دعبل خزاعی

25 اپریل 2025ء

اخوانی شیعیت

جدید دور میں "دہشتگرد تنظیم" کی اصطلاح ایسے منظم گروہوں کو بیان کرنے کے لئے وضع ہوئی ہے جو سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے دلیل اور تبلیغ کے بجائے قتل اور دہشت کا استعمال کریں۔ یہ پرامن طریقوں سے عوام کے سبھی طبقات کو ساتھ ملانے کے بجائے خوفزدہ کر کے محکوم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سوچ سب سے پہلے اٹلی اور جرمنی میں فاشزم کے نام سے نمودار ہوئی۔ اسی کی نقل پر ہندوستان میں ساورکر اور گوالکر نے ہندوتوا اور ہندو راشٹر کا نظریہ پیش کیا۔ مسلمانوں میں مصر کی تنظیم اخوان المسلمون نے اس سوچ پر اسلام کا لبادہ چڑھانا چاہا تو اس سے القاعدہ، داعش اور حزب التحریر وغیرہ جیسی تنظیمیں نکلیں۔ یہی لوگ جدید دور میں سیاسی اہداف والے فتنۂ تکفیر کے بانی بھی ہیں۔ مولانا مودودی اور سید قطب نے ربوبیت کی غلط تشریح کر کے اکثر مسلمانوں کو جاہلیت کا شکار قرار دیا اور از سرِ نو مومن بننے کی شرط اپنے فاشزم کی پیروی کو قرار دیا۔ یہ مذہب کو ریاست کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ ایران میں ولایتِ فقیہ کے نام پر جو حکومت بنی ہے اس کا اصولی شیعیت میں موجود ولایتِ فقیہ کے پرانے تصور سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اخوان المسلمون اور جماعتِ اسلامی کے ادیبوں کے خیالات کا عکس ہے۔ ان ادیبوں میں سید قطب اور مولانا مودودی کا اثر سب سے زیادہ رہا ہے۔ انہوں نے دوسری جنگِ عظیم سے پہلے اٹلی اور جرمنی میں

چلنے والی نسلی فاشزم کی تحریکوں سے متاثر ہو کر ایک مذہبی فاشزم کا نظریہ بنایا جس کی نقل کو ایران میں ولایتِ فقیہ مطلقہ کے عنوان سے پھیلایا گیا۔ اثناء عشری شیعہ مسلک میں اخباری اور اصولی مکاتبِ فکر کے بعد یہ ایک تیسرا مکتبِ فکر ظاہر ہوا ہے جسے اخوانی شیعیت کہا جاتا ہے۔ اس مقالے میں اخوانی شیعیت کے آغاز اور ارتقاء پر بحث کی جائے گی۔

ولایتِ فقیہ کی اصطلاح کے پرانے معنی

شیعہ عقیدے کے مطابق اسلامی حکومت صرف امامِ معصومؑ قائم کر سکتا ہے، غیبتِ امامؑ میں کوئی حکومت اسلامی نہیں ہو سکتی البتہ جمہوری طریقے سے عدل و انصاف کی صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہئیے، جس کی بنیاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قرآنی حکم پر ہے۔ امامِ معصومؑ کی اطاعت میں زبردستی کا عنصر نہیں ہوتا اور انسان قوتِ ایمانی کے بل بوتے پر اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ امامت کا مطلب کوئی نظامِ حکومت نہیں کیوں کہ نظام اصل میں ملت کے منظم ہونے کا نام ہے اور ملت کے حالات ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں، مثلاً ایک صنعتی معاشرے اور ایک زرعی معاشرے میں ایک جیسا نظام نہیں ہو سکتا لیکن امام ایک ہی رہے گا۔ شیعہ مسلمان امامت کو اصولِ دین کا حصہ یوں سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر فرد ذاتی طور پر تو مسلمان ہی رہتا ہے لیکن اجتماعی نظام اسلامی نہیں بن سکتا۔ اس کی بنیاد وہ آیات اور احادیث سمجھی جاتی ہیں جن میں ولی، مولا، امام یا امیر کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی میں حَکَم سے مراد قاضی ہوتا ہے۔ صدرِ اسلام میں حکمران کے لئے ولی یا مولا یا امیر کے الفاظ

مستعمل تھے اور ججوں کو حَکَم یا قاضی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ شیعہ عقیدے کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں اور رحلت سے قبل بڑے واضح انداز میں کئی مرتبہ حضرت علیؑ کو ولی، مولا اور امیر مقرر کیا۔ لیکن امام مہدیؑ نے کسی کو مولا یا ولی یا حکمران مقرر نہیں فرمایا۔ حتیٰ ان چار نائبینؓ، جن کی نیابت نص سے قائم ہوئی، کو بھی حق حکومت حاصل نہ تھا۔ قرآن میں بھی مولوی صاحبان کو ارباب بنانے سے منع کیا گیا ہے۔

﴿اِتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا﴾۔ [1]

ترجمہ: ”انہوں نے اپنے مولویوں اور راہبوں کو اللہ کے سوا رَب بنالیا۔“

علمائے حقہ کو انبیاء کا وارث کہا گیا ہے لیکن آئمہؑ کا وارث نہیں کہا گیا، چنانچہ ان کا کام صرف تبلیغِ حق ہے۔ اہل تشیع کے ہاں غیبتِ امامؑ میں اسلامی نظام کا قیام ممکن نہیں۔ آخری زمانے میں امام مہدیؑ کے ظہور کی نوید سنانے کی حکمت ہی یہ ہے کہ ان کے سوا کوئی اسلامی نظام نہیں بنا سکتا۔ شیعہ فقہاء کے ہاں ولایتِ فقیہ کافی پرانی اصطلاح ہے، مگر اس کا قرآن و حدیث میں کوئی وجود نہیں اسی لئے اس کا عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ولایتِ فقیہ کی اصطلاح اصولی شیعیت میں ان امور کے لئے بنائی گئی جو کمیونٹی ویلفیئر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا مقصد ایک نیک کردار کے حامل فقیہ کو عصرِ غیبت میں مالِ امامؑ کو خرچ کرنے پر اختیار دینا تھا۔ نیز قضاوت، یتیموں یا ذہنی معذوری کے شکار افراد کی جائیداد امانت کے طور پر سنبھالنا، اوقاف کے امور، وغیرہ فقہاء کی سرپرستی میں شامل سمجھے گئے۔ عوامی خدمت کے کاموں کو فقہ میں امورِ حسبیہ بھی

[1]۔ سورہ توبہ: آیت 31۔

کہا جاتا ہے [1]۔اس ولایت سے مراد حکومت نہ تھی، کیونکہ فقیہ کی حکومت قرآن و حدیث کی شیعہ تعبیر سے متصادم ہوتی۔

ایشیاء کے پہلے جمہوری انقلاب سے پہلوی آمریت تک

امریکہ میں جمہوری انقلاب 1775ء اور فرانس میں 1789ء میں آیا تھا۔ایشیاء کا پہلا جمہوری انقلاب 1907ء میں ایران میں آیا اور اس کے بانی معروف مرجع آخوند خراسانی تھے۔انہوں نے اصولِ فقہ کی بنیادی کتاب "کفایۃ الاصول" بھی لکھی ہے۔ان کے مطابق چونکہ غیبت میں اسلامی حکومت ممکن نہیں، لہٰذا غیر اسلامی نظاموں میں سے سیکولر جمہوریت بہتر ہے کہ جس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بنیاد پر ظلم کو کم کیا جاسکے۔انہوں نے کہا:

> "شرعی طور پر حکومت کرنے، عوام کے امور کو چلانے، مسلم معاشرے کے مسائل کے حل کرنے اور اہم فیصلے کرنے کا حق صرف اور صرف معصومؑ کا ہے کہ جو اللہ کی طرف سے منصوب و منصوص و مامور و تائید یافتہ ہو، جیسا کہ انبیاؑء و اولیاؑء کے زمانے میں تھا یا امیر المومنینؑ کی خلافت کے وقت تھا اور جیسا حضرت حجتؑ کے ظہور و رجعت کے

---

[1]۔ (الف)۔سید مرتضیٰ تقوی،"نقدی بر مقالہ انظار فقیہان در ولایتِ فقیہ"، فقہ، شمارہ 3، حوزہ علمیہ قم، 1374 شمسی۔[ensani.ir/fa/article/60110]۔

(ب)۔شیخ حسن اللہ یاری، البیان الوجیہ فی ابطال ولایۃ الفقیہ 1، 16 نومبر 2020ء۔

[youtu.be/j1QLKyBrEDg]

زمانے میں ہوگا۔ اگر ولایتِ مطلقہ معصوم کے پاس نہ ہو تو یہ غیر شرعی بادشاہت ہوگی۔ چونکہ یہ غیبت کا زمانہ ہے تو یہاں دو قسم کی غیر شرعی حکومتیں ہو سکتی ہیں: پہلی انصاف پر مبنی جمہوریت کہ جس میں عوام کے معاملات متعدد دین دار عقلمندوں کے ہاتھ میں ہوں، اور دوسری ظلم و جبر کی حکومت جس میں ایک خودسر شخص ولیٔ مطلق بن بیٹھے۔ پس عقل اور شرعی نصوص کے اعتبار سے غیر شرعی حکومتوں میں جو عادلانہ ہو اسے ظالمانہ حکومت پر برتری حاصل ہوگی۔ انسانی تجربے اور دقیق اور تسلی بخش غور و فکر سے واضح ہو چکا ہے کہ جمہوریت استبداد کے ظلم میں کمی لاتی ہے اور کمتر برائی کو زیادہ برائی پر فوقیت دینا واجب ہے۔ ایک مسلمان کیسے جابر سلطان کی حکومت کو شرعی کہنے کی جرات کر سکتا ہے جبکہ سلطنت کو غصب شدہ سمجھنا مذہبِ جعفری کی ضروریات میں سے ہے؟"۔ [۱]

یہ آئیڈیل نظام نہ ہوگا اور علمائے دین کو سیاسی عہدوں سے دور رکھا جائے گا۔ [۲]

آخوند خراسانی نے قومی ریاست کے تصور کو "وحدتِ دولت و ملت" کے عنوان سے بیان کیا کہ جس کا مطلب ریاست اور قوم کا ایک ہونا ہے، یعنی ایسا نہیں کہ ریاست حاکم

---

[۱]۔ محسن کدیور، "سیاست نامۂ خراسانی "صفحات 214، 215، طبع دوم، تہران سنہ 2008ء۔ [kadivar.com/1253]۔

[۲]۔ علامہ نائینی، "تنبیہ الامہ وتنزیہ الملہ "صفحات 41، 42، طبع سوم، تہران، سنہ 1955ء۔

ہو اور قوم محکوم، بلکہ قوم کا منظم ہو کر امورِ زندگی کو انجام دینا ہی ریاست ہے۔ اس زمانے میں ایران کی محض اکیس فیصد آبادی شہروں میں رہتی تھی۔ جمہوریت کے بانیوں نے ایران میں جدید سکولوں، تعلیمِ نسواں، ہسپتالوں، کارخانوں اور جدید انتظامی ڈھانچے کی بنیاد رکھی۔ روس اور برطانیہ نے 1911ء میں حملہ کر کے اس جمہوریت کو جلد ہی ختم کر دیا۔ 1908ء میں تیل دریافت ہو چکا تھا اور 1913ء میں ایران کے شہر آبادان میں پرشین آئل کمپنی نامی ایک برطانوی کمپنی نے تیل نکال کر بیچنا شروع کر دیا۔ 1914ء میں جنگِ عظیم اوّل چھڑ گئی۔ ایران پر روس اور برطانیہ کا قبضہ تھا۔ 1919ء میں فلو کی وباء کے ساتھ ایران میں غذائی بحران آیا اور ایک تہائی آبادی مر گئی۔ 1921ء میں ایران کے آرمی چیف نے دوبارہ بادشاہت قائم کر دی اور برطانیہ اور روس کا اثر و رسوخ کم کرنے کے لئے امریکہ اور جرمنی سے تعلقات بنائے۔ ان کا نام رضا خان پہلوی تھا، انہوں نے جمہوریت کو ختم کیا مگر باقی شعبوں میں جمہوری انقلاب کی شروع کردہ اصلاحات کو جاری رکھا۔ طوائف الملوکی کو ختم کر کے امن و امان قائم کیا، ملک بھر میں تعلیمی نظام قائم کیا، ہسپتال بنائے، ریل اور سڑکوں کا جال بچھایا، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ رائج کئے، محکمۂ انصاف، پولیس اور محکمۂ مال میں جدت پیدا کی، سائنس، قانون اور تاریخ کی تعلیم کے لئے یونیورسٹی قائم کی، بری فوج میں جدت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ فضائیہ اور بحریہ کی بنیاد رکھی، بنکوں کا نظام بنایا، انجن سازی کا کارخانہ لگایا جس سے ایران اپنی ضرورت کی گاڑیاں خود بنانے لگا، اچھے نمبر لینے والے طالب علموں کو پڑھائی کے لئے باہر بھیجنا شروع کیا۔ البتہ ساتھ ساتھ

اپنی دولت میں بھی اضافہ کیا، لوگوں کو سیاسی مکالمے کی آزادی نہ دی اور خواتین کے چادر پہننے پر پابندی لگائی جس کی وجہ سے کئی خواتین نے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا۔ آزادی چھین لی جائے تو لوگوں میں احساسِ ذمہ داری پیدا نہیں ہوتا۔ زبانوں پر تالے لگائے جائیں تو لوگ چپ نہیں ہوتے بلکہ بند دروازوں کے پیچھے بولتے ہیں اور اہلِ علم سے دور ہونے کی وجہ سے فکری قید خانوں میں جہالت پرورش پاتی ہے۔

دوسری طرف 1923ء میں مصر کے سلفی عالم محمد رشید رضا نے "الخلافة أو الإمامة العظمىٰ" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں خلافت کا تصور ایک منظم ریاست کے طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اس پر ان دنوں اٹلی میں جاری فاشزم کی لہر کی گہری چھاپ تھی۔ اس بدعتی سوچ کی بنیاد پر 1929ء میں مصر میں ایک تنظیم، اخوان المسلمون، کی داغ بیل ڈالی گئی جس کی نشریات عراق میں بھی آتی تھیں۔ 1920ء کی دہائی میں ہی برصغیر میں تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد دارالعلوم دیوبند سے نکلنے والے اس کے مجلے "الجمیعۃ" کے مدیر سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اٹلی و جرمنی کے نسلی فاشزم کی طرز پر ہی مذہبی فاشزم کے تصورات گھڑنا شروع کئے۔ البتہ جید سنی علماء، جیسے شیخ ناصر الدین البانی، نے ان کی انحرافی سوچ کو مسترد کیا۔ 1941ء میں جنگِ عظیم دوم کے دوران روس اور برطانیہ نے دوبارہ ایران پر قبضہ کیا۔ جرمنی کے لئے نرم گوشہ رکھنے والے رضا خان پہلوی کو ہٹا کر ان کا پندرہ سالہ بیٹا محمد رضا پہلوی بادشاہ بنا دیا گیا۔ ایران میں جمہوریت دوبارہ آئی اور محمد رضا پہلوی کا کردار ملکۂ برطانیہ کی طرح علامتی ہو گیا۔

اخوانی شیعیت کا ظہور اور مرجعیت سے بغاوت

سید مجتبیٰ میرلوحی (عرف نواب صفوی) نامی ایک اٹھارہ سالہ طالب علم 1942ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد دینی تعلیم حاصل کرنے نجف کے حوزے میں گئے مگر دو سال بعد، 1944ء میں، اخوان المسلمون کے پروپیگنڈے کی زد میں آ کر دینی تعلیم ترک کر دی۔ 1945ء میں نواب صفوی نے ایران میں اخوان المسلمون کی طرز پر خلافت لانے کے لئے فدائیان اسلام نامی تنظیم بنائی جس نے پہلا قتل ایک سرکاری جج احمد کسروی (متوفیٰ 1946ء)، دوسرا وفاقی وزیر عبدالحسین حاضر (متوفیٰ 1949ء) اور تیسرا وزیر اعظم علی رزم آراء (متوفیٰ 1951ء) کا کیا۔ 1951ء میں نواب صفوی نے "برنامۂ انقلابِ فدائیان اسلام" کے نام سے ایک کتابچہ لکھ کر اسلام اور فاشزم کا اخوانی ملغوبہ ایران میں متعارف کرایا۔ اس میں انہوں نے سود سے پاک معاشی نظام، غریبوں کے لئے لنگر اور کپڑوں کے انتظام، ہر سو نیکی کے چرچے، کنواروں کی جلد شادیوں، فلموں اور گانوں پر پابندی، ذاکرین اور موٴذنوں کی تربیت، مغربی لباس (پینٹ شرٹ) پہننے پر پابندی، مخلوط تعلیم کے خاتمے، چوری چکاری اور شراب اور جوئے میں ملوث افراد کے ساتھ سختی سے نبٹنے اور زناکاروں کو سرِ عام کوڑے مارنے، ہر دفتر میں پرچم ایران کے ساتھ ایک پرچمِ اسلام رکھنے کا اعلان کیا۔ لیکن ان کا کتابچہ قومی آئین، بجٹ بنانے، قومی خزانے کو چلانے، کاروباری قوانین، جدید علوم کے لئے درکار تعلیمی نظام، مواصلات، دفاع اور صحت عامہ کے بارے میں کسی قسم کی سمجھ بوجھ سے بالکل عاری تھا۔ اس سے ان کی

جہالت اور قومی ریاست کے حقیقی سوالات سے نابلد ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ایک میٹرک پاس مولوی سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے؟[۱] اس وقت ایرانی سیاست میں جمہوریت نواز، کہ جن کی قیادت احمد قوام کر رہے تھے، اور کمیونزم کی حامی حزبِ تودہ ایک دوسرے کے حریف سمجھے جاتے تھے۔ان کے علاوہ بھی کئی سیاسی گروہ موجود تھے، جن میں مذہبی جذبات کی سیاست کرنے والے آقائے کاشانی اور ڈاکٹر مصدق کی حزبِ ایران قابل ذکر ہیں۔ 1951ء میں ایرانی وزیراعظم ڈاکٹر مصدق نے تیل کی صنعت کو برطانوی کمپنی کی تحویل سے نکال کر حکومتی تحویل میں لینے کی کامیاب تحریک چلائی تو نواب صفوی نے خواتین کو ریاستی طاقت کی مدد سے حجاب کا پابند بنانے اور شراب کی خرید و فروخت روکنے کی تحریک چلا دی۔آقائے کاشانی، جو اب تک نواب صفوی کی حمایت کرتے آرہے تھے، نے فدائیانِ اسلام کو برطانوی مہرہ قرار دیا۔

1953ء میں امریکہ نے ڈاکٹر مصدق کے خلاف مارشل لاء لگوا کر اختیارات شاہ کو دلوا دیئے تو فدائیانِ اسلام نے جشن منایا اور شاہ سے کہا کہ وہ موسیقی پر پابندی لگائیں اور خواتین کو برقعے کا پابند بنائیں[۲]۔شاہ نے ملک میں جمہوریت کی بات کرنے پر پابندی لگائی۔شاہِ ایران کمیونزم اور جمہوریت، دونوں کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔انہوں

---

[۱]۔ S. Behdad, "Islamic Utopia in Pre Revolutionary Iran: Navvab Safavi and the Fada'iane Islam", Middle Eastern Studies, 1997.

[۲]۔ سید حسین خوش نیت، "نواب صفوی: اندیشہ ہا، مبارزات وشہادتِ او"، صفحات 127 اور 128، 1361 شمسی۔

نے سوچا کہ اخوانی شدت پسندی کے اس تیر سے یہ دو حریف شکار کرنا آسان ہوگا۔ جیسے شروع میں سید قطب کو جمال عبدالناصر نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا تھا، اسی طرح نواب صفوی کو محمد رضا شاہ نے جمہوریت اور مرجعیت کے خلاف استعمال کیا۔ فدائیان اسلام والے اپنے سے زیادہ پڑھے لکھے علماء کو دین فروش، بے وفا، دردِ دین کے بجائے درسِ دین میں ڈوبے رہنے والے، اور مراجع کو اپنی مرجعیت کی محبت میں اندھا اور دین کی محنت نہ کرنے والا قرار دیتے تھے۔ [۱]

اگر غور کیا جائے تو مودودی صاحب کی جماعتِ اسلامی اور سید قطب کی اخوان المسلمون اور القاعدہ جیسی تنظیموں کا روایتی سنی علماء کے بارے میں یہی رویہ ہے۔ جب آقائے سید حسین بروجردی نے نواب صفوی سے کہا کہ "ڈاکے ڈال کر اور دہشت پھیلا کر آپ لوگ اسلام کی کونسی خدمت کر رہے ہیں؟" تو نواب صفوی نے جواب دیا کہ "ہم لوگوں کا مال قرض کی نیت سے لوٹتے ہیں، اور ہمارا مقصد نظامِ علیؑ کا قیام ہے۔ ہمارا ہدف (اسلام کے) احکام سے بلند تر ہے۔ جب اسلامی حکومت بن جائے گی تو لوگوں سے لوٹا ہوا مال واپس کر دیں گے"۔ آقائے بروجردی نے اس تنظیم سے تعلق رکھنے والے طلاب کو حوزۂ قم سے نکالنے کا فیصلہ کیا تو ان کے حامی تصوف کے استاد سید روح اللہ خمینی نے کہا کہ "ان جوانوں نے کوئی ہتھیار یا اسلحہ اٹھائے بغیر، صرف اپنی تقریروں کی مدد سے، مقامِ مرجعیت کو خوفزدہ کر کے رکھ دیا ہے" [۲]۔ اخوانی شیعیت

---

[۱] ۔ رسول جعفریان، "جریان ہا و سازمان ہای مذہبی سیاسی ایران" ص 267، 1394 شمسی۔

[۲] ۔ رسول جعفریان، "جریان ہا و سازمان ہای مذہبی سیاسی ایران" ص 271، 1394 شمسی۔

یں مرجعیت کے خلاف بغاوت کا عنصر شروع سے ہے،خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑ رہا تھا۔تصوف ہمیشہ اجتہاد کی ضد رہا ہے۔اجتہاد میں رائے دینے سے پہلے منطقی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے معاملے کے تمام پہلوؤں پر تحقیق کرنا لازم ہوتا ہے اور مختلف اہل علم کی کتابوں کی مدد سے موضوع پر کافی آشنائی حاصل کرنے کے بعد ہی رائے قائم کی جاتی ہے اور اگر تحقیق کے تقاضے پورے نہ ہوں تو رائے دینے سے گریز کیا جاتا ہے۔دوسری طرف تصوف میں ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو علمِ حضوری سمجھ کر ڈٹ جانا ہوتا ہے، جو ایک غیر معصوم کے لئے کبھی بھی غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتے۔

نواب صفوی کا آقائے بروجردی سے ایک اختلاف یہ بھی تھا کہ آقائے بروجردی شیعہ وسنی میں تقریبِ مذاہب، برداشت اور مکالمے کے قائل تھے جبکہ نواب صفوی اخوانی طرز کی وحدتِ امت کے قائل تھے۔مولانا مودودی کی طرح نواب صفوی کے ہاں بھی اتحادِ امت کا جو معنی ہے وہ بدعت ہے،یعنی ایک ایسی فاشسٹ پارٹی بنانا مقصود ہے جو بغیر تفریق مسلک، سب مسلمانوں پر اپنی مرضی کی حکومت کرے گی۔

جدید دنیا میں اختلاف کو ختم نہیں کیا جاتا بلکہ مکالمہ اور برداشت کرنا سکھایا جاتا ہے اور رائے کے اظہار کی آزادی کو ہر شہری کا حق سمجھا جاتا ہے۔ہٹلر بھی اختلافات پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس سوچ کا نتیجہ جبر اور ظلم کی شکل میں سامنے آیا۔

1954ء میں اخوان المسلمون نے مصر کے صدر جمال عبدالناصر کو قتل کرنا چاہا

تو 1955ء میں فدائیان اسلام نے ایران کے وزیر حسین علاء کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ نواب صفوی کو اپنے تین ساتھیوں سمیت 31 سال کی عمر میں سزائے موت دے دی گئی، اب شاید کسی کو ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مصر میں سید قطب جیل میں ڈالے گئے اور ان کو 1966ء میں سزائے موت ہوئی۔ شیعہ مراجع جمہوریت اور اصلاحات کے حامی تھے۔ ان میں آخوند خراسانی کے شاگرد آقائے سید حسین بروجردی اور آقائے سید محسن الحکیم تھے۔ ان کے بعد آقائے سید ابوالقاسم خوئی، آقائے سید محمد کاظم شریعتمداری، آقائے سید محمد ہادی میلانی، آقائے سید محمد رضا گلپائگانی اور آقائے مرعشی نجفی کا دور آیا۔ یہ سب جمہوریت پسند تھے۔

تصوف کا شہسوار سیاست کے اکھاڑے میں

یہ وہ ماحول تھا جس میں ایک صوفی مسلک مولانا سید روح اللہ خمینی کی سیاسی سوچ کے خدوخال تشکیل پائے۔ وہ 1950ء تک ابن عربی اور ملا صدرا کے تصوف میں مگن رہے تھے، ان کی اکثر کتابیں اسی موضوع پر ہیں۔ اہل تشیع کے ہاں تصوف کو گمراہی سمجھا جاتا ہے اور آئمہؑ کے بہت سے اقوال میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔ جدید سائنس بھی تصوف کو غلط ثابت کر چکی ہے۔ نواب صفوی کی سزائے موت کے بعد سید روح اللہ خمینی نے اخوانی شیعیت کا بیڑہ اٹھایا۔ انہوں نے 1963ء میں حکومت کے خلاف ایک تقریر کی جس کے بعد قم میں ہنگامے ہوئے۔ پولیس نے ان کو گرفتار کیا تو ان کی جان بچانے کے لئے آقائے شریعتمداری نے آقائے ہادی میلانی کی مخالفت کے باوجود خمینی صاحب کو مرجع قرار دے دیا تا کہ وہ سزائے موت سے بچ سکیں۔ یہ تاریخ

مرجعیت میں نظریہ ضرورت کا پہلا استعمال تھا۔ پہلوی دور میں آئین میں یہ شق شامل تھی کہ مراجع کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ خمینی صاحب کو ترکی اور پھر وہاں سے نجف بھیج دیا گیا۔ اخوانی رسائل میں 1963ء کے ہنگاموں کے دوران سیکڑوں طلاب کے قتل کئے جانے کا پروپیگنڈا کیا گیا جبکہ آج تک ان طلاب کے نام، شناختی کارڈ نمبر، قبریں، اور ان کے والدین یا خاندان کی معلومات سامنے نہیں آسکیں۔ لاہور میں جماعتِ اسلامی کے رسالے ترجمان القرآن میں بھی اکتوبر 1963ء کے ایڈیشن میں "ایران میں دین اور لادینی کی کشمکش" کے عنوان سے ایک تکفیری مضمون چھپا جس پر ایرانی سفیر نے احتجاج کیا۔ حقیقت یہ تھی کہ پولیس کے لاٹھی چارج سے صرف تین لوگ زخمی ہوئے تھے۔ 1965ء میں وزیراعظم حسن علی منصور قتل ہوئے۔ نجف میں خمینی صاحب نے آقائے محسن الحکیم کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا تو انہوں نے کہا کہ آپ لوگ اسلام نافذ نہیں کرسکیں گے لیکن آپ کی وجہ سے لاکھوں لوگ قتل ہوں گے۔ اس خون کا حساب کون دے گا؟ خمینی صاحب نے مایوس ہو کر فقہ پر کام شروع کیا اور آقائے ابوالحسن اصفہانی کی کتاب "وسیلۃ النجاۃ" پر تبصرہ مکمل کیا، جسے "تحریرالوسیلہ" کے عنوان سے چھاپا گیا۔ ان کا مقصد مرجعیت میں قدم جما کر اس منصب کا سیاسی استعمال کرنا تھا۔ البتہ اس زمانے میں نجف میں آقائے خوئی کا طوطی بولتا تھا، جنہوں نے تفسیر، حدیث، کلام، اصول فقہ اور فقہ میں بہت اعلیٰ کام کیا تھا، لہٰذا خمینی صاحب طلاب کو جذب کرنے میں زیادہ کامیاب نہ ہوئے۔

سرد جنگ میں مولانا مودودی اور سید قطب کا استعمال

روس اور امریکہ میں سرد جنگ چھڑ چکی تھی۔ امریکہ نے کمیونزم کے خلاف سعودی

عرب سے کہہ کر سلفی سیاست اور فاشزم کے سانچے پر تیار کئے گئے نام نہاد اسلامی نظام کی سوچ پھیلائی۔ سعودی عرب میں حج کا پلیٹ فارم استعمال کر کے شیخ رشید رضا، مولانا مودودی اور اخوانی ادیب سید قطب کا مخصوص سیاسی نظریہ پھیلایا گیا۔ یہ کتب ایران و عراق بھی گئیں اور وہاں شیعہ طلاب میں کچھ ان صاحبان کے پیروکار بن گئے۔ جدید جمہوری ریاست کے حق میں آخوند محمد کاظم خراسانی، آقائے اسماعیل محلاتی اور آقائے محمد حسین نائینی جیسے جید علماء کی کتب تو دکانوں اور نصاب سے غائب تھیں، لہٰذا اس سوچ کو قدم جمانے کی جگہ ملی۔ اب اخوانی کتب فارسی میں ترجمہ ہونے لگیں۔ ایک تخمینے کے مطابق 1960ء کے عشرے میں سید قطب کی انیس اور ان کے بھائی محمد قطب کی سترہ کتابیں فارسی میں ترجمہ ہوئیں [۱]۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی اہم ہے کہ القاعدہ کے رہنما اسامہ بن لادن جوانی کے ایام میں سعودی عرب میں محمد قطب کے شاگرد رہے ہیں، جو اپنے بھائی کی پھانسی کے بعد مصر سے سعودی عرب بھاگ آئے تھے۔ مولانا مودودی سید احمد بریلوی سے بہت متاثر تھے جنہوں نے 1827ء میں پشاور میں ملا راج قائم کیا تھا [۲]۔ سرد جنگ کے دوران ہی ایران میں مولانا مودودی کی کتب کے تراجم اور علی شریعتی کی غیر علمی کتب بھی پھیل رہی تھیں۔ ساواک کی دستاویزات کے مطابق شریعتی کو شاہ کی حمایت

---

[۱]۔ S. Bohdan, "They Were Going Together with the khwan: The Influence of Muslim Brotherhood Thinkers on Shi'i Islamists during the Cold War", Middle East Journal, 2020.

[۲]۔ ڈاکٹر مبارک علی، "المیۂ تاریخ"، باب 11، صفحات 107 تا 121، فکشن ہاؤس لاہور، (2012)۔ [www.drmubarakali.org/urdu.html]۔

حاصل تھی۔ یہ سب کتابیں تاریخی حقائق اور اعداد وشمار سے ناواقفیت کا مظہر ہیں، البتہ جذباتی پن اور چرب زبانی کی وجہ سے نیم خواندہ افراد کے لئے مشکل سوالات کا آسان مگر غلط جواب فراہم کر کے تسکین کا باعث بنتی رہیں۔ یہ وہ دور تھا جب ایران میں زرعی اصلاحات کی وجہ سے لوگوں کی بڑی تعداد غربت سے نکل کر متوسط طبقے میں شامل ہوئی اور شہروں کی طرف رخ کیا۔ انہیں برادری سے دور ہونے اور شہری زندگی اپنانے کے دوران دوستوں کی ضرورت تھی جو شدت پسند تنظیموں کی شکل میں ملے، اور سوالات کے فوری جوابات کی ضرورت تھی جو ان سطحی کتب سے ملے۔ [1]

سید علی خامنہ ای پر سید قطب کے اثرات

فارسی کے اخوانی مترجمین میں ایک نام سید علی خامنہ ای نامی نوجوان مولانا کا بھی تھا۔ مشہد سے تعلق رکھنے والے اس طالب علم نے جوانی میں قدم رکھا تو ان کو نواب صفوی کی تقریروں نے بہت متاثر کیا۔ اس نے اپنا حوزے کا درس چھوڑ کر سید قطب کی تفسیر "فی ظلال القرآن" کی تین جلدیں اور ان کے علاوہ ان کی دو کتب، "المستقبل لهذا الدين" اور "الإسلام و مشكلات الحضارة" ترجمہ کر ڈالیں۔ سید قطب کوئی عالم نہیں تھے، بلکہ بہت سے مغالطوں کے شکار ایک ادیب تھے اور علامہ البانی جیسے کئی جید علماء نے ان کو رد کیا ہے۔ یہی حال مولانا مودودی کا بھی

---

[1]۔ A. Mashayekhi, "Tehran, the Scene of Modernity in the Pahlavi Dynasty: Modernisation and Urbanisation Processes, 1925 to 1979", Urban Change in Iran, 2015.

تھا، وہ بھی ایک اچھے ادیب سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ جنوری 1966ء میں علی خامنہ ای صاحب نے مودودی صاحب سے بھی رابطہ کیا اور ان کی تین کتابیں منگوائیں: "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں"، "اسلام کا نظام حیات" اور "اسلامی دستور"[1]۔ اس وقت خامنہ ای صاحب کی عمر ستائیس سال تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آقائے سید ہادی میلانی مشہد میں درسِ خارج دیا کرتے تھے، لیکن جوان لڑکوں کا ایک گروہ جو سید قطب اور مولانا مودودی کا دم بھرتا تھا، ان کے درس میں ہنگامے کرتا تھا۔ 1968ء میں مولانا نعمت اللہ صالحی نے "شہیدِ جاوید" نامی کتاب لکھ کر واقعۂ کربلا کی وہی تشریح پیش کی جو مولانا مودودی نے اپنی "خلافت وملوکیت" میں پیش کی تھی۔ اس میں یہ کہا گیا کہ امام حسینؑ کا مقصد خلافت کا قیام تھا، جبکہ شیعہ عقیدے کے مطابق امامؑ کا مقصد دین کو بچانا تھا۔ مراجع نے اس کتاب کو گمراہ کن قرار دیا اور آقائے صافی گلپائیگانی نے اس کے جواب میں "شہیدِ آگاہ" کے عنوان سے کتاب لکھی۔

عراق ایران تنازعہ اور شطرنج کے پیادے

1970ء کی دہائی میں عراق اور ایران میں شط العرب (اروندرود) نامی سرحدی علاقے پر تنازعہ چل رہا تھا۔ لہٰذا رضا شاہ عراق کے کردوں کی تو صدام حسین خمینی صاحب کی تحریک کی پشت پناہی کرتے تھے۔ عراق ایرانی صوبے بلوچستان میں بھی علیحدگی پسندی کی حمایت کر رہا تھا، چنانچہ بھٹو دور پاکستان میں عراقی سفارت خانے سے اسلحہ ملا اور

[1]۔ سید نثار علی ترمذی، "مولانا مودودی: داعیٔ وحدتِ امت"، صفحہ 129، البصیرہ، اسلام آباد، 2015ء

ایرانی ہیلی کاپٹرز کی مدد سے بلوچستان میں آپریشن بھی کیا گیا۔ اگرچہ اس عرصے میں عراق میں آقائے محسن الحکیم اور ان کے بعد آقائے خوئی کے خلاف کئی اقدامات اٹھائے گئے، جن میں بڑی تعداد میں ان کے شاگردوں کو عراق بدر کرنا بھی شامل تھا، لیکن خمینی صاحب اور ان کے ساتھیوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ چنانچہ نجف میں اپنے قیام کے دوران خمینی صاحب نے بھی عراقی حکومت کے کسی اقدام کے خلاف کوئی بیان جاری نہ کیا۔ بعض اوقات عراق کے ریڈیو کی فارسی نشریات میں خمینی صاحب کے پیغامات بھی نشر ہوتے تھے [1]۔ 1974ء میں خمینی صاحب نے ولایتِ فقیہ کے پرانے تصور میں محمد رشید رضا اور سید قطب کا نظریۂ سیاست ڈال کر ولایتِ فقیہ کا معنیٰ و مفہوم بدل دیا۔ اس امتزاج (التقاطی تصور) کو انہوں نے "ولایتِ فقیہ یا حکومتِ اسلامی" کے عنوان کے تحت ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا، جسے بعد میں "ولایتِ مطلقۂ فقیہ" کہا جانے لگا۔ ان خیالات کا رد آقائے خوئی کی کتابوں میں آیا ہے۔ یہ کتاب کافی حد تک محمد رشید رضا صاحب کی کتاب "الخلافۃ" کا چربہ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے دلائل کی کمزوری کے پیشِ نظر اپنے پیروکاروں کو ان نظریات کی مخالفت کرنے والے مراجع پر تہمت لگانے اور ان کے عمامے نوچ لینے کی ترغیب بھی دی [2]۔ یہ بات ان سے قبل

---

[1]۔ محسن کدیور، تہمت و پدیدہ موسیٰ موسوی، 12 اسفند 1397 شمسی۔ [kadivar.com/16913]

[2]۔ (الف)۔ آڈیو فائل، عمامہ ہای شان را بر دارید! امام خمینی بدون تحریف۔
[youtu.be/H3ct3WZ2rQM]۔
(ب)۔ محسن کدیور، تہمت در حکومت اسلامی چاپ نجف، ۲۱ بہمن ۱۳۹۷ شمسی۔
[kadivar.com/16895]۔

آقائے بروجردی کے بارے میں فدائیانِ اسلام بھی کر چکے تھے[1]۔ چنانچہ 1977ء میں اصفہان میں آقائے خوئی کے نمائندے آقائے سید ابوالحسن شمس آبادی کو اخوانی نظریات کی مخالفت میں خطبے دینے پر اغوا کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس واردات اور 2007ء میں پشاور میں دیوبندی طالبان کے ہاتھوں اپنے ہی مسلک کے شیخ الحدیث مولانا حسن جان کے قتل میں کافی شباہت ہے۔ 18 جون 1977ء کو علی شریعتی کثرت سگریٹ نوشی کی وجہ سے دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ وہ 1965ء میں قائم ہونے والی ایک اخوانی تنظیم "مجاہدین خلق" میں کافی طرفدار پیدا کر چکے تھے۔ یہ تنظیم بعد میں مسعود رجوی کی قیادت میں ایک جرائم پیشہ گروہ کی شکل اختیار کر گئی اور اس کے ارکان کا بہت بُری طرح استحصال کیا گیا۔ اگست 1978ء میں خمینی صاحب کے پیروکاروں نے ریکس سینما کو آگ لگا دی جس میں چارسو افراد زندہ جل گئے۔

ملا نراقی اور سید احمد بریلوی کے تجربے سے سبق نہ سیکھا گیا

خمینی صاحب اہل تشیع میں ملا راج کی بات کرنے والے پہلے شخص نہ تھے۔ ان سے پہلے ایک اور صوفی، ملا احمد نراقی (متوفیٰ 1829ء)، بھی اپنی کتاب "عوائد الایام" میں فقیہ کی ولایت کو بادشاہت کے رنگ میں پیش کر چکے تھے۔ یہ خیال انہوں نے بابائے تصوف افلاطون کے "فلسفی آمر" اور مدینۂ فاضلہ (Utopia) کے تصور کی بنیاد پر پیش کیا تھا۔ البتہ یہ اس دور کی بات ہے جب جدید سماج وجود میں نہیں آیا تھا، لہٰذا

---

[1]۔ علی رہنما، "نیروہای مذہبی بر بستر حرکت نہضت ملی" صفحات 57 تا 67، 1384 شمسی۔

سلطانئ فقیہ کا یہ تصور شخصی حکومت کے معنوں میں تھا، اور اس کا موجودہ نازی پارٹی کی طرز پر بنائے گئے نظامِ ولایتِ فقیہ مطلقہ کے ساتھ صرف لفظی اشتراک کا تعلق ہے۔ستم ظریفی دیکھئے کہ ملا نراقی نے بھی غیبی امداد کے وعدے دے کر 1826ء میں ایرانیوں سے ایک پڑوسی ملک (روس) کے خلاف ایک بے معنی جنگ کرائی تھی، جس کے نتیجے میں ایران کو آرمینیا سمیت کئی علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور جنگ بندی کی ذلت آمیز شرائط کا جامِ زہر پینا پڑا۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ ملا نراقی دنیا میں آئی ہوئی تبدیلیوں سے آگاہ نہ تھے۔صوفیا جس چیز کو علمِ حضوری کہتے ہیں، وہ جہل مرکب ہوتا ہے۔ چنانچہ اٹھارویں صدی میں برصغیر میں شاہ ولی اللہ جب احمد شاہ ابدالی کو دہلی لوٹنے کی دعوت دے رہے تھے، تو انگریزوں کی سائنسی ترقی اور یورپ کے حالات سے بالکل بے خبر تھے، یوں ابدالی کا حملہ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کا پیش خیمہ بنا۔تاریخی طور پر دیکھا جائے تو صوفیائے کرام کی خانقاہیں غلام داری اور مریدوں کے آمرانہ استحصال کے مراکز بھی رہی ہیں۔مرید کو اپنا پورا وجود شیخ و مرشد کی غلامی میں دینا ہوتا ہے اور وہ سوال نہیں کرسکتا۔ تصوف سیاسی طاقت حاصل کرے تو استبداد کی بدترین شکل بنتا ہے، اسی لئے فاشزم کو افلاطون کے یوٹوپیا کے سراب کی ترقی یافتہ شکل سمجھا جاتا ہے۔

ملا نراقی کے زمانے میں ہی ہندوستان میں اودھ کے ایک وہابی صوفی سید احمد بریلوی اور ان کے خاص مرید شاہ اسماعیل دہلوی (متوفیٰ 1831ء) نے بھی 1827ء میں پشاور میں فقیہ کی حکومت قائم کی تھی جس نے تباہی کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔سید احمد بریلوی بھی عرفانی باتیں کرتے تھے اور ان کو بھی امام کہا جاتا تھا اور

مخالفت کرنے والے کو قتل کرنے کا حکم تھا۔ان کے سیاسی تصوف کو شاہ اسماعیل دہلوی نے اپنی کتاب "منصب امامت" میں پیش کیا ہے۔ یہ حضرات شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد تھے، جن کی کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" اوراس کے نتیجے میں سید احمد بریلوی کی طرف سے تعزیئے جلانے اور "تحریکِ مجاہدین" نام کی تنظیم بنانے سے برصغیر میں دہشتگردی کا آغاز ہوا۔شاہ عبدالعزیز دہلوی نے معروف صوفی ملا صدرا کے تصوف پر "شرحِ ملا صدرا" کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی۔ان کے پیروکار 1860ء کی دہائی میں دیوبندی اور اہل حدیث میں بٹ گئے۔

اربنائزیشن کے اثرات

1970ء کی دہائی میں ایران میں لوگ غربت سے نکل رہے تھے اور متوسط طبقے میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا مگر ملک میں سیاسی تصورات پر علمی بحث اور مکالمے کی آزادی نہ تھی۔ 1974ء میں اوپیک نے تیل کی قیمت میں چار گنا اضافہ کرنے کا اعلان کیا جس سے ایران میں شہری ترقی کی رفتار تیز ہوگئی۔ ہزاروں طالب علموں کو وظائف دے کر مغربی ممالک میں جدید علوم سیکھنے کے لئے بھیجا گیا۔ 1976ء میں ایران کی 47 فیصد آبادی شہروں میں آچکی تھی۔تہران کی آبادی پچاس لاکھ تک جا پہنچی تھی اور ہر دس میں سے ایک شہری کے پاس کار تھی۔نو دولتیے کی علمی وسعت کم اور توقعات بہت زیادہ ہوتی ہیں۔شہروں کی نوجوان نسل میں کمیونزم اور اخوانیت تیزی سے پھیل رہے تھے۔جن کے والدین دیہات سے شہر آئے تھے، وہ نوجوان جلدی شادی کر کے نکاح کا پاکیزہ تعلق قائم کرنا چاہتے تھے۔دیہات میں معیارِ زندگی پست

ہونے کی وجہ سے شادیاں جلدی ہو جاتی تھیں۔لیکن شہروں میں رہنے والے متوسط طبقے میں شادی جلدی نہیں ہوتی، کیونکہ ان کا معیارزندگی بلند ہوتا ہے اورشہروں میں جوان ہوتے ہی ملازمت میسر نہیں ہو پاتی۔عظیم نفسیات دان ولہم رائخ کے مطابق جنسی بھوک کا فاشزم سے گہرا تعلق ہے کیونکہ جنسی نا آسودگی غصہ پیدا کرتی ہے اور ایسے فرد کے لئے منطقی انداز میں سوچنا ممکن نہیں رہتا۔وہ فاشزم کو جنسی نا آسودگی سے پیدا ہونے والی دیوانگی کا اجتماعی اظہار سمجھتے ہیں [۱]۔ان نا آسودہ جوانوں کے لئے اخوانیوں کا بلا سود قرضے دینے کا وعدہ اور کمیونسٹ پارٹی کا ریاست کو شادی کے بعد کی سب ضروریات پوری کرنے کا پابند بنانے کا جھوٹا وعدہ بہت پرکشش تھا۔حقیقت اس مغالطوں کے بالکل برعکس ہے۔ریاست لوگوں کے خرچے نہیں اٹھاتی بلکہ ریاست کے خرچے لوگوں کو اٹھانے ہوتے ہیں۔لوگ سرمایہ خرچ کر کے ریاست بناتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے لئے نظم وضبط کو بہتر بنا کر مسائل کم کرے اور اچھی زندگی گزارنے کا راستہ ہموار کرے۔زندگی کو بہتر لوگوں نے خود بنانا ہوتا ہے۔یہ مغالطہ بھی عام تھا کہ خود لذتی یا مشت زنی صحت کے لئے نقصان دہ ہے، جبکہ ایسا نہیں ہے [۲]۔البتہ اگر کوئی اسے شادی کا متبادل سمجھ لے اور خاندان کی ذمہ داری اٹھانے سے فرار کرے تو یہ معاشرے کے لئے اچھا نہ ہوگا۔اسی لئے جہاں اس عمل کے لئے کوئی سزا موجود نہیں

---

[۱]۔ Wilhelm Reich, "The Mass Psychology of Fascism", Souvenir Press, (2008).

[۲]۔ پروفیسر ارشد جاوید، "رہنمائے نوجوانی" صفحات 56 تا 75، بیسٹ بکس پبلیکیشنز، لاہور، 2013ء۔

ہے، وہیں اسے بعض مسالک میں مکروہ اور بعض میں حرام کہا گیا ہے تاکہ خاندانی نظام برقرار رہے۔

بہرحال کالج یونیورسٹی کے نادان بچوں میں کمیونزم اور اخوانیت پھیلنے سے ایران انقلاب کے لئے تیار ہو گیا تھا اور اس کے سوویت یونین میں ضم ہونے کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ 1977ء میں الجزائر میں ایران اور عراق میں دوستی کے معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے نتیجے میں شاہ نے عراقی کردوں اور صدام نے خمینی صاحب کی پشت پناہی ختم کرنے کا وعدہ کیا۔ خمینی صاحب فرانس چلے گئے اور مغرب کو ان میں ایسا کلہاڑا نظر آنے لگا جو ایران میں کمیونزم کے بتوں کو پاش پاش کر سکتا تھا۔ بی بی سی سمیت سب بڑے مغربی ذرائع ابلاغ ان کے پیغامات اور انٹرویو نشر کرنے لگے۔ 1979ء کا سال شروع ہوا تو ایران میں شاہ مخالف مظاہرے ہو رہے تھے۔ شاہِ ایران نے خانہ جنگی کا خطرہ منڈلاتا دیکھا تو شاپور بختیار کو وزیر اعظم بنا کر ملک سے نکل گئے۔ ایک تخمینے کے مطابق ایران کی گیارہ فیصد آبادی سڑکوں پر تھی۔ اس صورت حال کو سمجھنے کے لئے فرض کیجیے کہ اسلام آباد میں تین لاکھ اور لاہور و کراچی میں بیس بیس لاکھ لوگ سڑکوں پر نکل آئیں، اور انہیں اتنے ہی خاموش حامی بھی میسر ہوں، تو کیسا منظر ہوگا؟

اخوانی تصورِ وحدت: عدم برداشت اور مخالفین پر ظلم

اخوانی وحدت کی بات دھوکہ دینے کے لئے کرتے ہیں۔ اخوانی نظریات منطقی طور پر کمزور ہوتے ہیں، لہٰذا یہ لوگ ایک حد سے آگے اختلاف برداشت نہیں کر سکتے۔

1979ء میں ایران میں انقلاب آنے کے بعد خمینی صاحب نے مراجع کے نظریۂ جمہوریت سے انحراف کرتے ہوئے رشید رضا اور مولانا مودودی والا نظام لاگو کر دیا۔ امریکی خفیہ اداروں نے کمیونسٹوں کی کمین گاہوں کی معلومات مذہبی مجاہدین تک پہنچا کر اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگایا۔ یہاں آقائے طالقانی اور آقائے مرتضیٰ مطہری کی ناگہانی اموات کا ذکر بھی ضروری ہے کیوں کہ اس سے ایران میں نئی ریاست کی شکل گیری پر گہرا اثر پڑا۔ آج بھی یہ سوال حل طلب ہے کہ خانہ جنگی کے ماحول میں آقائے مطہری کو گارڈ کیوں فراہم نہ کئے گئے؟ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فقیہ کو حکمران کے بجائے نظریہ پرداز کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ آقائے طالقانی نے جمہوریت کے حق میں آقائے نائینی کی کتاب کو شائع کرنے کا اہتمام کیا تھا، انہیں دل کا دورہ پڑا تو ایمبولینس گھر کے قریب موجود دو ہسپتالوں کو چھوڑ کر تیسرے ہسپتال میں اس وقت پہنچی جب وہ انتقال کر چکے تھے۔ اب اخوانی لڑکوں کے لئے راستہ صاف تھا۔ اخوانی فاشزم کو قانونی شکل دینے میں مولانا سید محمد بہشتی نے اہم کردار ادا کیا، جو پانچ سال جرمنی میں رہ کر ہٹلر کے فاشزم کی جزئیات سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اس پر قم کے مرجع اعلیٰ آقائے شریعتمداری نے احتجاج کیا تو ان پر باغی ہونے کی تہمت لگا کر نظر بند کر دیا گیا۔ چنانچہ باقی مراجع نے اپنی کتب میں ولایتِ مطلقۂ فقیہ کو باطل کہنے اور علمی طور پر ولایتِ فقیہ کو امورِ حسبیہ تک محدود قرار دینے پر ہی اکتفا کیا۔

عراق میں 1968ء سے حاکم بعث پارٹی عرب نسلی فاشزم کی قائل تھی۔ جولائی 1979ء میں سنی اکثریتی علاقے تکریت سے طلاق رکھنے والے صدام حسین صدر بنے تو

پارٹی میں اپنے مخالفین کو مار کر اقتدار اپنے قبیلے والوں میں بانٹ لیا۔ستمبر 1980ء میں ایران عراق جنگ کا آغاز ہوا جس میں دس لاکھ لوگ مارے گئے۔جنگ کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب خمینی صاحب نے ایران پہنچ کر عراقی بعث پارٹی کے بارے میں اپنی سوچ بدلی اور عراقی عوام کو مذہبی فاشزم کی دعوت دینا شروع کی۔شاید وہ آقائے خوئی کے لئے مشکلات بڑھا کر ان کے ہوتے ہوئے مرجع نہ بن سکنے کا بدلہ بھی چکانا چاہتے تھے۔صدام نے داخلی خطرے سے نپٹنے کے لئے ایران پر حملہ کر دیا اور عراق میں اخوانی علماء کو قتل کر دیا۔خمینی صاحب سعودی وہابی علماء کو بھی اخوانی انقلاب کی دعوت دینے لگے تھے۔اگرچہ سرد جنگ کے دوران سعودی عرب اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کی کتابوں کو مسلم دنیا میں نشر کرتا رہا تھا لیکن عوام آلِ سعود کی بادشاہت کو وہابی علماء کی حکومت سے بہتر سمجھتے تھے۔خمینی صاحب اسلام کی اخوانی تشریح کو اسلامِ ناب کہتے تھے اور دوسری تشریحات کو، چاہے وہ شیعہ علماء نے کی ہوں یا سنی علماء نے، امریکی اسلام کہتے تھے اور ان دو تشریحات کی بنیاد پر مسلم دنیا میں نئی فرقہ بندی کی کوشش کر رہے تھے۔انقلاب برآمد کرنے کے نعروں سے مسلم دنیا میں فرقہ وارانہ جنگ شروع ہوگئی، جس پر جلد ہی شیعہ سنی جنگ کا رنگ چڑھ گیا۔صدام اور شاہ فہد اس فرقہ وارانہ قینچی کا ایک اور خمینی صاحب دوسرا دھارا تھے۔اب کی بار امریکہ نے صدام کی حمایت کی۔یہ جنگ خمینی صاحب کے لئے داخلی طور پر نعمت ثابت ہوئی۔ان کی کارکردگی پر سوال اٹھانے اور غیر سودی معیشت جیسے وعدوں کا حساب لینے کے بجائے لوگ اپنے پیاروں کی لاشوں پر رونے میں مصروف ہو گئے۔ 1988ء میں

خمینی صاحب نے جیلوں میں موجود سیاسی مخالفین کی تکفیر کا فتویٰ جاری کیا اور ہمیشہ کی طرح اس اخوانی فتوے کی بھی قم یا نجف کے مراجع نے تائید نہیں کی۔ اس کے نتیجے میں ابراہیم رئیسی اور پور محمدی نامی ججوں نے حکومت کے پانچ ہزار سیاسی مخالفوں کو قتل کر دیا، جن میں سے اکثر "مجاہدین خلق" نامی تنظیم سے تعلق رکھتے تھے۔ خمینی صاحب کی وفات کے بعد مولانا سید علی خامنہ ای رہبر بن گئے اور ایران سید قطب کے روحانی فرزند کے ہاتھ میں آ گیا۔ 1994ء میں خامنہ ای صاحب نے حکومتی طاقت کے بل بوتے پر خود کو مرجعیت کے منصب پر بھی فائز فرما لیا۔ چونکہ انہیں اپنے کسی استاد نے بھی اجازۂ اجتہاد نہیں دیا تھا، لہٰذا انہوں نے معاصرین سے اپنے اجتہاد کا اعلان کروایا۔ مجلسِ خبرگان کے آقائے آذری قمی نے اعتراض کیا تو انہیں اندر کر دیا گیا۔ صحافیوں کو خاموش کرانے کے لئے ٹارگٹ کلنگ کی گئی، جسے ایران میں "قتل ہائے زنجیرہ ای" کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہی معاملہ صدر محمد خاتمی اور رہبر کے بیچ دراڑیں پڑنے کا سبب ہوا۔ قم کی شیعہ مرجعیت تاریخ کے سخت ترین دور سے گزر رہی ہے۔ آقائے شریعتمداری کے بعد آقائے حسن قمی، آقائے سید محمد روحانی، آقائے سید صادق روحانی، آقائے سید رضا صدر، آقائے منتظری، آقائے محمد شیرازی سمیت کئی شیعہ مراجع حکومتی عتاب اور قید و بند کا نشانہ بن چکے ہیں۔ آقائے وحید خراسانی، آقائے صادق روحانی، آقائے شبیری زنجانی اور دوسرے صف اول کے فقہاء سرکاری صحافیوں اور انتظامیہ کے دباؤ میں رہتے ہیں۔ آقائے صافی گلپایگانی نے دنیا سے اچھے تعلقات رکھنے کا مشورہ دیا تو سرکاری صحافیوں نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔

ایران کی موجودہ صورتِ حال

آج بھی ایران میں سودی نظام ہے۔اسلام نافذ نہیں ہوسکا، خمینی صاحب کے وعدے کھوکھلے ثابت ہوئے۔تعلیمی نظام بھی مغربی ہے۔سیاسی نظام پہلوی دور جیسا ہی ہے، صرف حکمران کا چہرہ اور لباس بدلا ہے۔ پہلوی دور کی طرح نمائشی انتخابات بھی ہوتے ہیں۔البتہ حکومت کی طرف سے خواتین کے لباس پر کچھ دینی پابندیاں ضرور عائد کی گئی ہیں، اگرچہ اس کی بھی اسلامی مصادر میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ایران کے مذہبی عوام یہ جان چکے ہیں کہ نفاذِ اسلام امام مہدیؑ کا کام ہے، وہ دوسروں سے نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس دھوکہ دہی کی وجہ سے ایرانی عوام میں الحاد پھیل رہا ہے،لوگوں کے ایمان کو شاہ کے دور سے زیادہ خطرہ ملا راج میں ہے۔عوام کو طاقت کے مراکز کے خلاف احتجاج کرنے کا حق نہیں، سیدھی گولی چلائی جاتی ہے۔سرکاری میڈیا پر کئی صحافی درباری منتر پڑھتے رہتے ہیں۔مغرب ملاؤں کی مدد سے جہاں کمیونزم کے خلاف جہاد میں کامیاب ہوا ہے، وہیں ایران کو جرمنی، کوریا یا جاپان جیسی معاشی طاقت بننے سے روک کر خطے میں اپنی مارکیٹ بچانے میں کامیاب رہا ہے۔ایران کے اخوانی انقلاب کا ہی اثر یہ ہوا کہ دوسرے مسلمان ممالک میں علمائے دین کو تخت نشین کرنے کا جذبہ بڑھ گیا۔ اس سے خطے میں دہشتگردی اور فرقہ وارانہ کشت وخون میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حکومت کے معنوں میں ولایتِ مطلقہ فقیہ کا پرانی ولایتِ فقیہ سے کوئی تقابل نہیں۔ یہ سیاسی تصور مسلمان معاشروں کے لئے اخوان المسلمون، القاعدہ، حزب التحریر اور طالبان وغیرہ کے تصورات کی طرح نقصان دہ ہے۔ان سب کا ماخذ محمد

رشید رضا، مودودی اور سید قطب کی سیاسی بدعت ہے۔ البتہ اخوانی شیعیت میں مصری سلفیت کا کٹر پن بظاہر جداگانہ اصطلاحات میں پیش کیا جارہا ہے۔ علماء کی خلافت کا نام "ولایتِ مطلقۂ فقیہ" رکھ دیا گیا ہے، جدت سے مقابلے کو "مغربی تہذیبی یلغار سے مقابلہ اور سلف کی طرف پلٹنے کو" روایات کی کتب سے اسلامی تہذیب بنانا" کہا جارہا ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ ایرانی نظام اور ہٹلر کی نازی ریاست میں گہری مماثلت ہے۔ فوہرر کا فارسی ترجمہ رہبر ہے اور اسے ماورائے آئین اختیارات حاصل ہیں۔ گسٹاپو کا کردار سپاہ پاسداران نبھارہی ہے اور ہٹلر یوتھ کی نقل میں بسیج نامی تنظیم بنائی گئی ہے۔ گوئبلز کی مسند پر حسن عباسی بیٹھے ہیں اور اس سارے ڈھانچے کو نمائشی عدالتوں کی پشت پناہی حاصل ہے جو ہر سال سیکڑوں لوگوں کو سزائے موت دیتی ہیں۔

عراق میں سیکولر جمہوریت

2003ء کے بعد جب عراق میں نیا ریاستی ڈھانچہ بننے لگا تو اصولی اہل تشیع کے مرجع اعلٰی آقائے سید علی سیستانی نے ولایتِ مطلقۂ فقیہ کو رَد کر کے جمہوریت کی حمایت کی اور حوزے کو علمی تحقیقات اور نیکی کی تبلیغ تک محدود رہنے کی نصیحت کی۔ وہ ولایتِ مطلقۂ فقیہ کے ساتھ ساتھ تصوف کو بھی مسترد کرتے ہیں۔ [1]

پاکستان کے لئے سبق

ایران جیسے تیل اور گیس سے مالا مال ملک میں نفاذِ اسلام کی ناکام مثال

---

[1]۔ استفتاء از معظم لہ در بارہ عرفان صاحب فصوصی، 8 محرم الحرام 1433 ہجری۔
www.sistani.org/persian/archive/427

سے ہمیں یہ سبق سیکھنا چاہیئے کہ ملا راج پاکستان کو جبر، غربت، جہالت، خون خرابے، بیماریوں، پسماندگی اور ظلم کے سوا کچھ نہیں دے گا۔ افغانستان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پاکستان میں ہماری دین اور دنیا کی بھلائی قائداعظم کے سیکولر تصور پر چلنے میں ہے۔سیکولرازم کا مطلب دین کو سیاست سے الگ کرنا نہیں، بلکہ علمائے کرام کو سیاست سے الگ رکھنا ہے۔سیکولرازم یعنی جس کا کام، اسی کو ساجھے: ملک کو جدید خطوط پر چلانا جدید علوم کے ماہرین کا کام ہے اور اسلامی نظام بنانا امام مہدیؑ کا کام ہے، ان کی آمد سے قبل کسی اخوانی گروہ کے ہاتھوں استعمال ہونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پاکستان میں تازہ اعداد وشمار کے مطابق شہری آبادی کا تناسب 37 فیصد سے بڑھ چکا ہے، شہر بے قابو ہو کر پھیل رہے ہیں۔ اگر طالبانی سوچ کے سوا باقی سب کی آزادیٔ اظہارِ رائے ختم کی جاتی رہی اور توہین مذہب، سائبر کرائم لاء اور سرکاری اسلامیات کے نام پر مکالمے کا گلہ گھونٹا جاتا رہا تو تیزی سے بڑھتی ہوئی شہری آبادی سے اخوانی انقلاب آسکتا ہے۔ یہ انقلاب اکثریتی طبقے کے لئے بھی عذاب ہوگا، جیسا کہ نازی پارٹی جرمنوں پر بھی جبر کرتی تھی۔ اس کے بعد الحاد کی لہر آئے گی۔ عوام کو چاہیے کہ وہ اخوانی سوچ میں موجود گمراہیوں کے مقابلے میں خود بھی علم حاصل کریں اور دوسروں کو بھی آگاہ کریں۔

خوارج کی جدید شکل کے طور پر اُٹھنے والا اخوانیت کا فتنہ عالم اسلام کو کئی قد آور سیاسی شخصیات سے محروم کر چکا ہے۔ خود پاکستان میں لیاقت علی خان، ذوالفقار علی بھٹو، محترمہ بے نظیر بھٹو، سلیمان تاثیر، بشیر بلور، وغیرہ جیسی کئی باصلاحیت سیاسی شخصیات کا قتل

اسلام کی اسی تشریح کے مطابق ہوا ہے جو سیکولر مسلم سیاست دانوں کو آئمۂ کفر اور اخوانی ملاؤں کی پاپائیت کو ولایتِ رسول اللہؐ کی وراثت سمجھتی ہے۔ مصر میں وزیراعظم محمود النقراشی اور صدر انور سادات کو اسی آئیڈیالوجی کے وارث نے قتل کیا۔ اس قتل و غارت سے تخریب کے سوا کچھ نہیں ملا ہے۔ سیاست کا مطلب دلائل اور گفتگو سے معاملات کو طے کرنا ہوتا ہے۔ اخوانی جتھوں کے ان حربوں کے خلاف مسلمان عوام کی مزاحمت نے ثابت کیا ہے کہ ان کو گولی اور بم کی زبان سے یرغمال نہیں بنایا جاسکتا۔

ضمیمہ

1۔ایران میں سودی معیشت کے خلاف فتاویٰ

ایران میں انقلاب کے بعد معاشی نظام مغربی علوم پر قائم ہوا ہے اور ملکی معیشت سود پر چلتی ہے۔اس مسئلے پر ایران کے مطلق العنان رہبر کو اکثر مولوی صاحبان کی جانب سے تنبیہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔2018ءاور 2019ءکے سالوں میں ایران کے بڑے بڑے مولوی صاحبان نے ملک میں سودی معیشت کے خلاف صدائے احتجاج کو بلند کیا۔[1]

بیانات

1۔ اپریل 2018ء میں معروف اخوانی صوفی جناب جوادی آملی نے اپنے بیان میں کہا:

"قرآن نے شیطان کو متکبر کہا ہے،لیکن میرے حافظے کے مطابق قرآن میں اس کو محارب نہیں کہا گیا۔سودی بنک کاری اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ جنگ ہے۔آپ بے شک کسی سال کا نام سالِ اشتغال و تولید رکھتے پھریں،(ایران کے رہبر نے اس سے پچھلے ایرانی سال کا نام سالِ اقتصاد مقاومتی: تولید و

---

[1]۔ "واکنش ہمزمان 5 مجتہد و مرجع تقلید بہ ''نظام بانکی ربوی''/گزینہ ہای نظامی خداروی میز است"،خبر گزاری تسنیم،29 آذر 1395۔

www.tasnimnews.com/fa/news/1395/09/29/1270626.

اشتغال رکھا تھا)، جب تک سرمایہ سودی ہوگا، اصلاح نہیں ہوگی"۔ [۱]

2۔ فروری 2019ء میں آقائے ناصر مکارم شیرازی نے اپنے بیان میں کہا:

"بنکوں نے ایسے حالات پیدا کئے ہیں کہ لوگوں کی زندگیوں کو اجیرن کر دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ قرضِ حسنہ پر چار فیصد کی مستقل شرح سود پر لوگوں سے اپنا معاوضہ وصول کریں، ہر سال شرحِ سود میں چار فیصد مزید شامل کرتے کرتے یہاں تک لے جاتے ہیں کہ پانچویں سال قرض کی باقی ماندہ رقم پر واجب الادا سود بیس فیصد تک جا پہنچتا ہے۔ قرضِ حسنہ کے نام پر کھلم کھلا سود خوری جاری ہے"۔ [۲]

3۔ ستمبر 2018ء میں آقائے حسین نوری ہمدانی نے کہا:

"کئی بار کہا ہے کہ ہمارے بنک قرضے دے کر جرمانے کے نام سے جو رقم وصول کرتے ہیں، وہ سود ہے اور حرام ہے۔ لیکن حکمرانوں کو یا تو ہماری آواز سنائی نہیں دیتی یا وہ سنتے تو ہیں مگر عمل نہیں کرتے"۔ [۳]

---

[۱]۔ "فعالیت بانک ربوی محاربہ با خدا است"، خبرگزاری بین المللی قرآن، 15 فروردین 1397۔
iqna.ir/fa/news/3703168.

[۲]۔ "انفاق در شرایط فعلی یک وظیفۂ عمومی است"، بلیغ نیوز، 20 بہمن 1397۔
www.makarem.ir/news/fa/News/Details/416339.

[۳]۔ "آیت اللہ نوری ہمدانی: بارہا تاکید کردہ ایم کہ اخذ دیرکرد توسط بانک ہا حرام است ولی مسئولان عمل نمی کنند"، خبرگزاری تسنیم، 24 شہریور 1397۔
www.tasnimnews.com/fa/news/1397/06/24/1829377.

4۔ فروری 2019ء میں آقائے جعفر سبحانی نے کہا:

”لوگ بنک سے قرضہ لیتے ہیں اور بنک ان سے سود لیتے ہیں۔اس سود کے ساتھ ساتھ قرضہ واپس کرنے میں تاخیر پر بنک لوگوں کو جرمانہ بھی کر دیتے ہیں۔سب مراجع نے اس کو حرام کہا ہے۔علماء کی رائے کے مطابق عمل کریں“۔ [۱]

5۔ فروری 2019ء میں آقائے علوی گرگانی نے کہا:

” آج کل اقتصادی حالات برے ہیں۔ایسے حالات میں لوگ اپنے دینی فرائض بھی ادا نہیں کر پا رہے۔ایسے موقع پر (بنکوں کو) عوام سے سود لینے میں جلدی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ہم اسلامی نظام میں ایسے بنک چاہتے ہیں جو لوگوں کے خدمت گزار، مددگار اور دست و بازو بنیں۔ براہ مہربانی اپنے سود کی شرح کو تھوڑا کم کیجیے تاکہ لوگوں پر دباؤ کم ہو۔ یا کم از کم حالات کے حساب سے سود لیا کریں، مثلاً جب معاشی سرگرمی تیز ہو تو سود لینے میں کوئی ہرج نہیں مگر جب معیشت کا پہیہ سست ہو جائے تو لوگوں پر رحم کیا کریں اور کم سود لیا کریں“۔ [۲]

6۔ جنوری 2019ء میں آقائے حسین مظاہری نے کہا:

---

[۱]۔ ” آیت اللہ سبحانی: اخذ جریمہ دیرکرد حرام است؛ بانک ہا مطابق نظر مراجع عمل کنند“، خبرگزاری تسنیم، 108 سفند 1397۔

www.tasnimnews.com/fa/news/1397/12/08/1957015.

[۲]۔ ”انتقاد شدید آیت اللہ علوی گرگانی از گرانی ہای سرسام آور“، خبرگزاری رسا، 30 بہمن 1397۔

rasanews.ir/fa/news/598008.

"افسوس ہے کہ سود لینا اور سود دینا ایک عادت بن چکی ہے۔ بعض لوگ شرعی بہانے لگا کر ایسے سود کھاتے ہیں کہ مثلاً چوہے کو پانی سے دھو کر حلال قرار دے دیا جائے۔ اسی طرح رشوت لینا اور دینا بھی نظام میں سرایت کر چکا ہے۔ معمولاً کوئی کام رشوت کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی گرہ رشوت کے بغیر نہیں کھلتی اور نہ کوئی فائل پہیے لگائے بغیر آگے جاتی ہے"۔ [1]

---

[1]۔ "رباخوردن ور بادادن عادی شدہ است"، خبر گزاری رسمی حوزہ، دوشنبہ 17 دی 1397۔
www.hawzahnews.com/news/474885.

2۔ ملاراج یا مولویوں کی حکومت کیوں درست نہیں؟

آقائے محمد کاظم خراسانی، المعروف آخوند خراسانی، 1894ء سے 1911ء میں اپنی وفات تک اصولی اہل تشیع کے سب سے بڑے فقیہ مانے جاتے رہے۔ آپ اپنے علمی مقام کی وجہ سے آخوند، یعنی سب سے بڑا عالم، کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کی کتاب "کفایۃ الاصول" مشہور ترین کتابوں میں سے ہے جس کی چار سو شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔

آخوند خراسانی 1907ء میں ایشیاء کے سب سے پہلے جمہوری انقلاب کے بانیوں میں سے بھی ہیں، جس کے نتیجے میں ایران میں ایک جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ آخوند خراسانی نے انقلاب کی کامیابی کے بعد کوئی حکومتی اختیار قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ 1911ء میں اس نوزائیدہ جمہوریت کو روس اور برطانیہ کے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ 1915ء میں جنگ عظیم اول چھڑ گئی اور اس کے بعد 1920ء میں رضا خان پہلوی نے مارشل لا لگا کر ایران میں دوبارہ بادشاہت قائم کر دی۔

یہ مضمون آخوند خراسانی کے اپنے شاگرد آقائے نائینی کے سوالوں کے جوابات پر مبنی مکالمے کا خلاصہ ہے جس میں وہ جمہوریت کے حق میں اپنے دلائل بیان فرماتے ہیں۔ مفصل گفتگو کا فارسی متن اکبر ثبوت صاحب کی کتاب "دیدگاہ ہای آخوند خراسانی و شاگردانش" میں پڑھا جا سکتا ہے۔ آخوند خراسانی کی طرف سے پیش کردہ اکیس دلائل کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

1. اگر ایران میں شیعہ علماء نے حکومت پر قبضہ کیا تو دوسرے مسالک و مذاہب میں بھی یہ رجحان پیدا ہوگا کہ وہ بھی اپنی متعصب دینی حکومتیں بنائیں اور اس طرح پورا خطہ مذہبی جنگوں اور فرقہ وارانہ قتل وغارت کی لپیٹ میں آجائے گا۔

2. جب علماء حکومت میں قدم رکھیں گے تو اپنے نقائص کو نہیں دیکھ سکیں گے اور ان کی توجیہ کریں گے اور حکومتی خرابیوں کو نظر انداز کریں گے۔

3. مسند علماء خرابیوں سے مقابلے کی مسند ہے، اور حکمرانی کی مسند خرابیوں سے آلودہ ہوتی ہے۔ اس طرح (جب علماء حکومت کرنے لگے) خرابیوں کا مقابلہ کرنے والی مسند ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی اور علماء بھی فاسد ہو جائیں گے۔ وائے ہو اس روز پر جب نمک ہی خراب ہو جائے (فارسی ضرب المثل ہے کہ جب کوئی چیز خراب ہو تو اس کو نمک لگاتے ہیں، اور اگر نمک ہی خراب ہو جائے تو اسکا کوئی علاج نہیں)۔ اگر ہم فاسد و خراب نہ بھی ہوئے تو پھر بھی سب خرابیاں علماء کی گردن میں ڈالی جائیں گی اور یوں دین تباہ ہو جائے گا۔

4. حکومت چلانے کا علم اور سیاست ایک باقاعدہ علم اور ہنر ہے اور علماء اس علم و ہنر سے مکمل طور پر نابلد ہیں۔

علم و تجربے اور ہنر کے بغیر اس شعبے میں داخل ہونا علماء کی رسوائی کا باعث بنے گا۔ صرف علماء کا نیک ہونا دلیل نہیں کہ وہ ہر علم و ہنر کو جانتے ہیں۔

5. ہمارا مقصد و آرزو یہ ہے کہ حکومت دین کی پیروی کرے درحالیکہ اگر ہم نے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تو دین کے حکومت کی پیروی کرنے جیسے امر کا

شکار ہو جائیں گے۔

6. چونکہ لوگ ہمیں امام زمانہ علیہ السلام کا نائب سمجھتے ہیں اس لئے ان کو یہ توقع ہے کہ ہم امام مہدیؑ کی حکومت جیسے حالات پیدا کریں۔ جب ہم اس سطح پر عدالت کو برقرار نہ کر پائے تو امام زمانہؑ اور دین سے متعلق ان کا عقیدہ کمزور پڑ جائے گا۔

7. ابھی ہمارے پاس حکومتی عہدے نہیں ہیں تو اس قدر آپس کے جھگڑے ہوتے ہیں۔ اگر ہم حکومت تک پہنچ گئے تو یہ اختلاف نظر دین کے کئی حصوں میں تقسیم ہونے اور کئی نئے فرقے بننے اور دین کے نقصان کا باعث بنے گا۔

8. ہمیں فقط علم فقہ کا علم ہے۔ چونکہ ہم اچھے فقیہ ہیں (اگرچہ سب ابواب فقہ بھی ہم نہیں جانتے) یہ دلیل نہیں کہ دیگر علوم، جیسے اقتصادیات اور سیاست وغیرہ، میں بھی ماہر ہوں۔ علم فقہ اپنے موضوع کا علم ہے جس کا معاشرے کو چلانے اور اس کے مسائل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

9. اسلام کو کئی صدیوں سے حکومت اسلامی نے نہیں سنبھالا بلکہ اسلام کو حوزہ علمیہ و مدارس نے سنبھالا ہوا ہے۔

10. ابھی ہمارے ہاتھ حکومت نہیں آئی تو ہمارے قریبی لوگ کیا کچھ نہیں کرتے، وائے اس روز پر جب حکومت ہمارے ہاتھ میں آجائے۔ جب ہمارے پاس حکومت ہو گی، تو ہمارے رشتہ دار اس موقع کا ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور مرجعیت و دین اسلام کی رسوائی کا باعث بنے گے۔ اس وقت لوگ ان کے

ایسے کاموں کو ہمارے حساب میں لکھیں گے۔

11. جن کے پاس حکومتی عہدے ہوتے ہیں وہ جھوٹ وفریب اور مغالطے کو اپنے کام اور پیشے کی پہلی ضرورت سمجھتے ہیں، اور شاید بعض اوقات ان کے کام جھوٹ کے بغیر چل بھی نہیں سکتے، اور ممکن ہے بعض اوقات بہت اہم مصلحتوں کی وجہ سے ان کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہو۔ چونکہ ان عہدوں کی وجہ سے جھوٹ سے مکمل پرہیز ان کے لئے ناممکن ہے اس لئے علمائے دین کو ان عہدوں سے بچنا چاہئے۔ کیونکہ اگر سچائی وصحیح بات کی مکمل پابندی کریں تو ان کے کام نہیں چل سکیں گے، اگر یہ چاہیں کہ دوسرے سیاستدانوں کی طرح جہاں چاہیں جھوٹ بولیں، تو اس کام کے دو خطرے ہیں:

ایک یہ کہ آہستہ آہستہ جھوٹ کی برائی ان کی نظر میں ختم ہو جائے گی اور صداقت کی پابندی دیگر کاموں میں بھی کمزور ہو جائے گی، یہ کام سب کے لئے برا ہے لیکن عالم دین کے لئے سب سے زیادہ برا اور بہت ہی خطرناک ہے۔

دوسرا یہ کہ جب عام لوگ دیکھیں گے کہ علماء دین ہر بہانے سے اگرچہ وہ درست ہی کیوں نہ ہو، متعدد مواقع پر جھوٹ بولتے ہیں تو آہستہ آہستہ ان کے لئے یہ شبہ پیدا ہوگا کہ کہیں ایسے تو نہیں دیگر امور جیسے احکام الٰہی اور دینی و مذہبی عقائد میں بھی کسی وجہ سے، اگرچہ وہ وجہ درست ہی کیوں نہ ہو، وہ جھوٹ بولتے ہیں تو اس وقت عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہونا ہی بہت خطرناک چیز ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگوں میں دینی آداب ومبادی سے

متعلق بے عقیدتی پیدا ہوگی۔

12. جب تک عوام یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا عمل اور جد و جہد کا مقصد صرف ظلم کو کم کرنا اور کرپشن کے دائرے کو تنگ کرنا ہے۔ ہمارا ارادہ دنیوی غلبہ، منصب یا مراعات حاصل کرنے یا کسی خاص فرد یا گروہ کو اقتدار یا مرتبے تک پہنچانے کا نہیں ہے۔ جب تک لوگ ہمیں اس طرح جانتے رہیں گے، وہ یقین کریں گے کہ ہم اپنے اعمال میں مخلص ہیں اور ہمارے اعمال صرف خدا کے لئے ہیں۔ اور اسی یقین کی وجہ سے وہ ہمارے پیچھے چلیں گے۔ ہماری ضروریات اور مشکلات کو اپنی ضروریات اور مشکلات سے بھی زیادہ اہم سمجھیں گے۔ ہمارا ساتھ دینے اور ہمارے مقاصد کے حصول کی خاطر وہ دل اور جان کے ساتھ سخت محنت کریں گے اور ہر قسم کی مشکلات کو تحمل کریں گے اور قربانیاں دیں گے۔ لیکن اگر وہ محسوس کرنے لگے کہ ہم اقتدار کی جنگ میں داخل ہو چکے ہیں اور ہمارا مقصد خود دنیاوی غلبہ، منصب اور مراعات حاصل کرنا ہے۔ تا کہ ہمارے اقرباء اور رشتہ دار دنیاوی اقتدار، مرتبے اور مراعات تک پہنچ جائیں، تو ہماری نیتوں کے اخلاص پر ان کا یقین کمزور ہو جائے گا اور نہ صرف یہ کہ وہ سنجیدگی سے ہمارا اور ہمارے مقاصد کا ساتھ نہیں دیں گے اور اس راہ میں کوشش اور قربانی دینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، بلکہ آہستہ آہستہ وہ سیاست کی دنیا میں ہمیں اور ہمارے حریفوں کو ایک آنکھ سے دیکھیں گے اور آخر کار معاملہ اس مقام پر پہنچ جائے گا کہ نہ صرف وہ ہمارے مخالفین بلکہ

مذہب کے مخالفین سے بھی جا ملیں گے۔

13. دنیاوی اموال و اقتدار کے ساتھ وابستگی ایک بہت عظیم پردہ ہے جو ہمیں حقیقت کو دیکھنے اور اس کے مشاہدے اور خدا کے حکم کو سمجھنے سے روک سکتا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے کہ میں حقیقت کو جاننے کی راہ میں موجود رکاوٹوں کو کم کرنے کے بجائے اپنے لئے بہت زیادہ اور بہت بڑی رکاوٹیں پیدا کروں، تاکہ دانستہ اور نادانستہ طور پر احکام الٰہی کے استنباط میں ان رکاوٹوں سے متاثر ہو جاؤں، اور صحیح احکام تک پہنچنے اور ان کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی وابستگیوں اور خواہشات کا جواز پیش کرنا شروع کروں؟ کیوں نہ میں مقام و منصب سے اپنے لگاؤ کو جو میرے اور ہر انسان کے اندر ہے اور صدیقین کے دلوں سے نکلنے والی آخری چیز ہے، کو قابو میں رکھوں؟

14. پندرہ سال پہلے سید جمال الدین افغانی اسدآبادی کہا کرتے تھے:

"جدیدیت (Modernity) کا سیلاب مشرق کی طرف تیزی سے آرہا ہے۔ مطلق العنان حکمرانی کی بنیاد فنا ہونے والی ہے۔ آپ مطلق العنان حکمرانی کی بنیاد کو تباہ کرنے کی جتنی کوشش کر سکتے ہیں کریں۔" میں اگرچہ سیاست کی دنیا میں سید کی بعض باتوں اور پالیسیوں سے متفق نہیں ہوں، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ ان کی یہ بات بالکل درست ہے، اور نہ صرف یہ آج سچ ہے، اور پندرہ سال پہلے سچ تھی، بلکہ ایک صدی پہلے بھی سچ تھی۔ ہمیں سو سال پہلے (1800 کے عشرے میں) اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ مطلق العنان

حکمرانی کی بنیاد تباہ ہونے والی ہے اور اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے ہمیں خود مطلق العنان حکومت، جو کہ خرابیوں (کرپشن) اور بے شمار مظالم کی جڑ ہے، کے خلاف جدو جہد کرنے والوں کا علمبردار بننا چاہیئے تھا اور ظلم وخرابی (کرپشن) کو کم کرنے کے لئے ہمیں حکمران کے اختیارات کا دائرہ محدود کر دینا چاہیے تھا اور مطلق العنان حکومت کے بجائے قانون کی پابند حکومت قائم کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اس معاملے میں ہم نے اتنی دیر کر دی کہ تقریباً سو سال کے انتہائی تلخ ایام اور بدترین حالات گزارنے کے بعد، اب عقلاء نے مطلق العنان حکومت کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کو کم کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا ہے۔ اس کے بعد انہیں چاہیے کہ وہ اس کام سے پرہیز کریں کہ تمام حکومتی اختیارات ایک جگہ پر جمع ہو جائیں اور حکومت جو کام بھی کرے اس سے متعلق اس سے باز پرس ہو۔

وہ حکومتی اختیارات کو تقسیم کر کے ان کو عوام کے زیر نظر قرار دیں اور آمر حکمرانوں کے بے شمار و ناجائز اختیارت پر پابندی لگائیں۔ اس تحریک کے مقابلے میں بعض لوگوں نے دین کے نام اور حکومت مشروعہ (اسلامی بادشاہت) کا پرچم اس طرح اٹھایا ہوا ہے جیسا کہ امیر المومنین علیؑ کے مقابلے میں کچھ لوگوں نے قرآن کے نسخوں کو نیزوں پر اٹھایا ہوا تھا اور ان کا یہ اصرار ہے کہ حکومت مطلقہ (بادشاہت) کو برقرار رکھا جائے تا کہ ان کے مطابق شریعت کی حد محفوظ رہے۔ جب کہ نہ تو مشروطیت (1907ء کے

جمہوری انقلاب) کے قیام سے پہلے اور نہ ہی اس کے دبانے کے بعد (یہاں استبداد صغیر کی طرف اشارہ ہے، 24 جون 1908ء کو شاہ کے شیخ فضل اللہ نوری کی مدد سے تہران میں قتل و غارت کر کے جمہوریت کو ختم کرنے اور ملک بھر کے عوام کے قیام کے بعد 14 نومبر 1909ء کو جمہوریت کے بحال ہونے کے درمیان کی مدت کو ایرانی تاریخ میں استبدادِ صغیر کہتے ہیں)، شریعت اور مقدس الٰہی احکام کی حدود محفوظ نہیں تھیں اور یہ لوگ جو جمہوری حکومت (مشروطہ) کو ختم کرنے اور بادشاہت (مشروعہ) جاری رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کا مقصد صرف اور صرف اپنے مفادات کا تحفظ کرنا اور مخلوق خدا کے جان و مال پر اپنا ناجائز و مطلق قبضہ جاری رکھنا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تحریک جمہوریت کا مقصد صرف بادشاہت نامی سرکش گھوڑے کو ہی لگام ڈالنا نہیں، بادشاہ اور اس کے کارندوں کو اپنے ماتحتوں اور عوام پر ظلم و زیادتی اور ناجائز کاموں اور من مانی و جابرانہ حرکتوں سے روکنا ہی نہیں، بلکہ جمہوریت کا مقصد یہ ہے کہ تمام ظالموں، حکمرانوں، صاحبان اختیار و سربراہوں کو کنٹرول کیا جائے، تاکہ وہ اپنے ماتحتوں اور اپنے جیسوں پر ظلم نہ کر سکیں، اور لوگوں سے رشوت و بھتہ اور نذرانے نہ لے سکیں۔ ہاں جمہوری نظام کا حتمی مقصد یہ ہے کہ تمام ظالموں کے ہاتھ ہر ممکن حد تک باندھ دیئے جائیں تاکہ وہ عوام کے حقوق پامال نہ کر سکیں۔ اگر یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور عوام علم اور میدان میں حاضری کے

ساتھ اس مرحلے تک پہنچ جاتے ہیں کہ ظلم کسی بھی لباس میں ان پر حکمرانی نہیں کرسکتا، تو ہم ان تباہیوں کا مشاہدہ نہیں کریں گے جو سلطنت کے کارندوں نے ابھی تک کی ہیں اور نہ کسی فردِ واحد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ قانون سے بالاتر ہو اور قانون ساز بھی خود ہو، عدلیہ بھی خود ہو اور انتظامیہ بھی خود ہو۔

15. دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور کسی کو آپ علماء پر اور آپ کے مذہب پر اس وجہ سے اعتراض نہیں ہوتا کہ اس کی بیماری کا علاج نہیں کر سکے۔ اس لئے کہ آپ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آپ کا مذہب بیماریوں سے شفاء کا ذمہ دار ہے، اور مریضوں کا علاج کرنا آپ علمائے دین کے فرائض میں سے ہے۔ اب اگر آپ اپنے دین اور علماء کی عظمت میں اضافہ کرنے کے لئے ایسا دعویٰ کرتے ہیں تو آپ اپنے دین اور اپنے آپ پر بہت بھاری بوجھ ڈالیں گے اور تمام لاعلاج بیماریوں کی ذمہ داری آپ پر اور آپ کے مذہب پر عائد ہوگی۔

یہی حال سیاست کا بھی ہے۔ ہم سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم لوگوں کے تمام دنیوی امور کو منظم طریقے سے انجام دینے کے لئے بہترین لائحہ عمل پیش کریں اور خود اس منصوبے پر عمل کرانے والے ہوں اور ان کے تمام سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کو حل کریں۔ ان کو ہم سے صرف یہ امید ہے کہ ہم مخلوق خدا کے مصائب و مشکلات اور ان کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم، بدعنوانی اور لوٹ گھسوٹ کے معاملے میں غیر جانبدار نہ رہیں۔

16. یہ نظریہ کہ اگر علماء میں سے کوئی ایک حکومت کا سربراہ بن جائے تو دنیا کے حالات بہتر ہو جائیں گے، وہی افلاطون کا نظریہ ہے جو یہ کہتا تھا کہ مدینۂ فاضلہ (Utopia) قائم کرنے کے لئے فلسفی کو بادشاہ ہونا چاہیے تاکہ ہر عیب سے پاک معاشرہ بنا سکے۔ ہمارے عقیدے کے مطابق جب تک اقتدار بغیر کسی نقص کے امامِ معصومؑ کے ہاتھ میں ہو اور اسے اپنے ارادے کو نافذ کرنے میں مزاحمت کا سامنا نہ ہو، تبھی مثالی معاشرہ قائم کرنا ممکن ہے۔ لہٰذا معاشرے کے حالات کی اصلاح علمائے کرام کے محض قیادت کو قبول کرنے سے ممکن نہیں ہے اور اگر یہ کام ممکن ہوتا تو امام صادقؑ کو جب حکومت کی سرپرستی کرنے کی پیشکش کی گئی تو وہ اس کو رد نہ کرتے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب ابو مسلم خراسانی نے امام صادقؑ سے درخواست کی کہ آپ امت اسلامیہ کی قیادت کو قبول فرمائیں اور اجازت دیں کہ آپ کی قیادت میں اسلامی حکومت بنائی جائے تو آپؑ نے فرمایا:

مَا أَنْتَ مِنْ رِّجَالِيْ وَلَا الزَّمَانَ زَمَانِيْ۔

''نہ تم میرے لوگ ہو اور نہ ہی یہ وقت میرا وقت ہے''۔

امامؑ نے حکومت کی کرسی پر بھروسہ کرنے کے بجائے خدا کے بندوں کی تعلیم اور رہنمائی کے ذریعے، جہاں تک ممکن ہو سکا، عوام کی علمی سطح کو بلند کرنے کے عظیم اقدامات اٹھانے کو ترجیح دی، تاکہ انتظامی حالت اور سماجی نظام میں بہتری لائی جاسکے۔

17. ہمیں اپنی پوری تاریخِ مرجعیت میں سیاست کی دنیا میں غلط فیصلے کرنے کے دو متوازی طریقوں کا سامنا رہا ہے۔ ایک افراطی (ضرورت سے زیادہ مداخلت) اور دوسرا تفریطی (ضرورت سے کم مداخلت)۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ"لا تری الجاھل إلا مفرطاً أو مفرطا"، (آپ جاہل کو افراط یا تفریط کے علاوہ کسی حالت میں نہیں پائیں گے)۔

مثال کے طور پر غور کریں کہ سو سال پہلے ہمیں ظلم کا مقابلہ کرنے اور کرپشن کو کم کرنے کے لئے جو کہ ہمارے معاشرے میں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہوئی تھی، جدو جہد کرنا چاہیے تھی، اور اپنے معاشرے کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے زیادہ کوشش کرنی چاہیے تھی۔ قوم کی اصلاح و ترقی کے لئے اہم اقدامات کرنے چاہیے تھے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا اور ان اہداف کی خاطر سنجیدہ قدم اٹھانے کے بجائے (1804ء میں) ہم نے طاقتور زارِ روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور اس کے باوجود کہ ہمیں ایک بار سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا ہم نے سبق نہیں سیکھا اور دوسری بار (1826ء میں) وہی غلطی دہرائی۔ اگرچہ ایسے حالات بھی پیش آئے کہ جب روسی دوسرے علاقوں میں اپنی مشکلات میں پھنسے ہونے کی وجہ سے بہتر شرائط پر جنگ بندی کا معاہدہ کرنے کو تیار تھے، لیکن ہم نے ایسے نہیں کیا یہاں تک کہ روسیوں کو ان کی دیگر پریشانیوں سے چھٹکارا مل گیا۔ پھر وہ پوری طرح دل و جان سے ہمارے سامنے آئے اور پوری طاقت سے ہم پر حملہ کیا اور ہمیں اتنی بڑی شکست دی کہ

ہمارے ملک کے بیس وسیع ضلعے اپنے قبضے میں لے لئے اور اس جنگ کے بھاری تاوان اور نقصان کا بوجھ ہم پر ڈال دیا اور ہمیں اپنے قونصل خانے کے فیصلوں کا پابند بنا دیا۔ خدا ہی جانتا ہے اس جنگ کی دوسری آفتوں سے ہم کب چھٹکارا پائیں گے۔ اس کے علاوہ اس تباہ کن شکست کی وجہ سے ہمارے علماء جیسے آغا سید محمد (عرف سید مجاہد)، ملا احمد نراقی اور ملا محمد تقی برغانی شدید تنقید کا نشانہ بنے اور بعض اوقات ان کی توہین کی گئی۔ تاہم ہماری غلطی یہ تھی کہ ہم نے انتہائی خراب داخلی صورت حال کو سدھارنے کی کوشش کرنے کے بجائے دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک کا مقابلہ دنیا کی سب سے کرپٹ اور سب سے کمزور حکومت کی قیادت اور سرپرستی میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور لوگوں میں جنگ کا شوق پیدا کرنے کے لئے، فقہ آل محمدؑ، معصومینؑ اور قرآن کریم کے نام پر ہم نے یقینی فتح کا وعدہ دے دیا۔ شکست کے بعد دوست و دشمن کے اعتراضات کا ایک سیلاب ہماری طرف بہہ نکلا کہ ان یقینی وعدوں کے پورا ہونے کے بجائے، وہ بھی خدا، پیغمبرؐ اور آئمہؑ کے نام سے دیئے گئے وعدے، ہمیں ایسی ذلت آمیز شکست اور عبرتناک نتائج کا سامنا کیوں کرنا پڑا؟

18. شیعہ مذہب کی بقاء و دوام کا سب سے اہم عنصر جو اس مکتب کو دوسرے اسلامی فرقوں سے ممتاز کرتا ہے، اجتہاد ہے۔ اگرچہ یہ صرف اجتہاد نہیں بلکہ اجتہاد مطلق ہے، کیونکہ چاروں سنی مذاہب میں سے ہر ایک کے پیرو فقہاء بھی اجتہاد کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اجتہاد ان حدود میں ہوتا ہے جن کا

تعین اس فرقے کے رہنما نے کیا ہوتا ہے، نہ کہ بہ صورت مطلق۔ مثال کے طور پر حنفی مسلک کا اجتہاد اور طریقہ ابو حنیفہ کے اجتہاد اور مسلک تک محدود ہے، آزادانہ نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اہل تشیع کے برعکس سنیوں میں آزادانہ سوچ وفکر کرنا اور اجتہاد کیوں نہیں؟ اور ان کے درمیان باب اجتہاد اپنے حقیقی معنی میں بند کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب حکومتیں سنی مذاہب کی سرپرست بنیں تو وہ اجتہاد اور آزاد فکر سے خوفزدہ تھیں اور اسے اپنے حکومتی مفادات اور مصلحتوں کے منافی سمجھتی تھیں تو انہوں نے اجتہاد کا دائرہ تنگ کر دیا اور آزادنہ فکر کرنے کو حرام قرار دیا اور سب کو پابند کیا کہ وہ اپنے اجتہاد وفکر کرنے کے دائرے کو چار اماموں میں سے ایک کے اجتہاد وفکر کے مطابق انجام دیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں نے بھی اپنے پاس وسیع حکومتی اختیار کے بغیر، جہاں بھی ضرورت پڑی اور جس حد تک ان کے پاس طاقت اور سہولت تھی، اپنے مخالفین اور اپنی ہی صنف (علماء وفقہاء) کے افراد کی آزادانہ سوچ اور اظہار رائے کو روکا ہے۔ اور اکثر اوقات انہوں نے کوشش کی کہ جو بھی ہمارے نظریات، بلکہ ہمارے مفادات، کے خلاف کوئی بات کہے تو اس کا منہ بند کر دیں اگرچہ وہ علم وتقوی کی کسی بھی سطح کا حامل ہی کیوں نہ ہو۔ اس مقصد کی خاطر ہمارے علماء بھی بارہا اپنے ہی مسلک کے بعض علماء کو کافر اور فاسق قرار دینے کی حد تک گئے ہیں اور ان اقدامات اور طریقوں سے ہم نے اپنے دین وفقہ کو علمی لحاظ سے

شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ان المناک واقعات کو روکنے کے لئے جتنی بھی توانائی وسہولت ہمیں میسر ہے، اسے بروئے کار لا کر ایسے اقدامات اٹھانے ہوں گے کہ جن سے کوئی بھی رکاوٹ و پابندی اجتہاد اور آزادئ فکر کی راہ میں حائل نہ ہو۔ اس طرح کے اقدامات کرنے کے بجائے ملاؤں کی حکومت بنا کر اقتدار و اختیارات کے دائرے کو وسیع کرنے کی کوشش کرنا اور جو طاقت اس وقت ہمارے پاس ہے اس کو کئی گنا مزید بڑھانا غیر معقول ہے۔ چونکہ اس طرح کرنے سے ایسے ناخوشگوار واقعات کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور اس کے منفی نتائج ہمارا اور ہمارے مکتب کا دامن پکڑ لیں گے۔ اور جو کچھ ہم بنا رہے ہیں اسے اپنے ہاتھوں سے خود ہی تباہ کر دیں گے۔

19. اس وقت صورتحال یہ ہے کہ عام لوگوں کے لئے مجھ تک پہنچنا کسی اور تک پہنچنے کی نسبت آسان ہے۔ جو کوئی مجھے خط لکھے اور نجف بھیج دے وہ خط مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔ جو بھی نجف میں آئے وہ کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ کر سکتا ہے۔ اگر میں گھر پر ہوں تو وہ دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آسکتا ہے اور اگر میں مدرسہ، مسجد یا حرم میں ہوں تو مجھ تک پہنچنا اور بھی آسان ہے۔ نہ کوئی دروازہ اور نہ کوئی کنڈی، نہ کوئی دربان، نہ کوئی محافظ، نہ کوئی پیشگی اجازت اور طے شدہ ملاقات، مختصر یہ کہ کوئی بھی مجھ سے کسی بھی صورت حال میں رابطہ کر سکتا ہے اور کوئی بھی مسئلہ یا مشکل بیان کر سکتا ہے۔ اب اگر میں ایک حکمران کی جگہ لے لوں تو مجھ تک پہنچنا اور مجھ سے ملنا اور بات کرنا کسی اور تک پہنچنے اور اس سے ملنے اور بات کرنے

سے زیادہ مشکل ہو جائے گا۔اس سے میرے اور معاشرے کے بیچ ایک پردہ حائل ہو جائے گا۔

20. اگر ہم حکومت پر قبضہ کرنا چاہیں تو حتماً ان سیاستدانوں کو دبانا ہوگا جو ظلم سے نجات اور قومی حکومت کے نعرے کے ساتھ ظلم کے خلاف جدوجہد میں ہمارے ساتھ کھڑے تھے۔ان کو دبانے کا بلاشبہ عوام پر برا اثر پڑے گا اور کہا جائے گا دیکھا! مذہبی رہنماؤں نے آمرانہ حکومت کے خلاف جدوجہد کے دوران سیاست دانوں اور قومی لیڈروں کی حمایت ونظریات کا استعمال کیا اور جب اقتدار میں آ گئے تو اب مکمل اقتدار اور سب اختیارات پر قبضہ کرنے اور مطلق العنان حکومت اور ظلم کو ایک نئی شکل میں باقی رکھنے کے لئے انہوں نے سیاست دانوں اور قومی شخصیات کو دبا دیا ہے۔یعنی کہ جو کچھ خلیفہ سفاح نے ابوسلمہ اور سفاح کے بھائی منصور نے ابومسلم کے ساتھ کیا۔

21. ہمارے شیخ (شیخ انصاری) علمائے دین کی حکمرانی کو قبول نہیں کرتے، وہ اس کام (علماء کے حکومت کرنے یا بنانے) سے متعلق دلائل میں علمی طور پر ناقابل حل اعتراضات کو مدنظر رکھنے کے علاوہ یہ بھی جانتے تھے کہ حکومتی عہدے خواہ نخواہ ایسے امور کا باعث بنتے ہیں جن کے نتائج فقیہ کے تقویٰ اور عدالت اور فقیہ کی فقاہت واجتہاد کے لئے بھی خطرناک ہوتے ہیں،اس لئے وہ فقہاء کی حکومت کے خلاف تھے۔ [1]

---

[1]۔ ”دیدگاہ ہای آخوند خراسانی وشاگردانش“، مصنف اکبر ثبوت، فصل اول۔

3۔آقائے سیستانی: جمہوریت کے نگہبان

(پروفیسر کارولین سایج)

20 جنوری 2003ء کو، عراق پر امریکی حملے کے آغاز سے دو ماہ پہلے، بش انتظامیہ نے پینٹاگون کو عراق کی سیاسی اور معاشی تنظیمِ نو کے عمل کی نگرانی کے لئے تعمیرِ نو اور انسانی امداد کا ادارہ (او آر ایچ اے) قائم کرنے کا حکم دیا۔اس ادارے کے سربراہ جے گارنر کو بتایا گیا تھا کہ ان کی ماموریت آسان اور مختصر ہو گی۔محکمہ دفاع کے نائب معتمد برائے حکمت عملی، ڈوگلس فیتھ نے کہا کہ نوے دن میں ایک عبوری حکومت قائم کر کے سفارتی تعلقات بحال اور امریکی فوج کا انخلا شروع کر دیا جائے گا۔بش انتظامیہ امریکی عوام کو بتاتی رہی تھی کہ عراق پر طویل مدت کے لئے قبضہ برقرار رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی کیوں کہ عراقی عوام امریکی فوج کا آزاد کنندگان کی طرح استقبال کریں گے۔خیال یہ تھا کہ صدام حسین کے بعد تعمیر نو کے امریکی منصوبوں کی کوئی مخالفت نہ ہو گی۔اس کے اقتدار سے محروم ہونے کے بعد عراق امریکہ کے سامنے ایک صاف تختی کی طرح ہو گا۔شروع میں گارنر بعث پارٹی کو استحکام اور امن کو قائم رکھنے کے لئے باقی رکھنا چاہتا تھا تا کہ پہلے سے موجود ریاستی انتظامیہ کو ساتھ لے کر چلے، لیکن یہ رائے امریکی محکمہ دفاع کے سینئر عہدیداروں اور نائب صدر کے ہاں غیر مقبول تھی۔ان اداروں میں امریکی حملے کے منصوبہ ساز بعد از صدام کی عراقی ریاست کی شکل

گیری میں ان عراقیوں کے ساتھ مل کر چلنا چاہتے تھے جنہیں صدام کے زمانے میں وطن چھوڑنا پڑا تھا۔

21اپریل 2003ء میں، جنگ شروع ہونے کے ایک ماہ بعد، گارنر کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کر کے اس ادارے کو تحلیل کر دیا گیا اور 11 مئی کو نیدرلینڈ میں امریکہ کے سابق سفیر اور محکمۂ خارجہ کے سینئر افسر پال بریمر کی سربراہی میں سلطۃ الائتلاف المؤقتۃ (کوالیشن پروویژنل اتھارٹی؛ سی پی اے) کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کیا گیا۔ 28 جون 2004ء میں عبوری حکومت کے قیام تک سی پی اے نے عراق پر بلا شرکت غیرے حکومت کی۔ سابقہ تارکین وطن اور دو کرد جماعتوں کے مشوروں پر چلتے ہوئے ایک وائسرائے کے انداز میں بریمر نے بہت سے مثالیت پسندی پر مبنی فیصلے کئے جو عراق کے سماجی اور سیاسی حقائق کی بابت کم علمی اور لاتعلقی کا مظہر تھے۔ فرامین میں عراقی ریاست سے بعثی اثرات کا صفایا اور عراقی فوج کے کورکمانڈرز کو منصبوں سے ہٹانا سرفہرست تھا۔ بریمر نے بعثی اثرات کے خاتمے کے عمل پر پوری لگن سے کام کیا کہ جس کے نتیجے میں ہزاروں فوجی افسروں کو تنخواہوں اور مراعات سے محروم کر کے مستقبل میں سرکاری نوکریوں کے لئے نااہل قرار دیا گیا۔ وہ عراقیوں کی اکثریت کی رائے معلوم کرنے کے کسی طریقۂ کار کو وضع کئے بغیر معیشت کے بڑے حصے کو نجی ملکیت میں دینے، اعلیٰ تعلیم کے نظام کی تنظیمِ نو اور آزاد جمہوری ریاست کے قیام کے قائل تھے۔ ان منصوبوں پر عمل درآمد کی ذمہ داری سی پی اے کے ذیلی افسران اور پرائیویٹ کنٹریکٹرز کے کندھوں پر تھی جن میں سے اکثر کے

پاس اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ نہ تھا اور ان میں سے کچھ تو محض نظریاتی طور پر بریمر سے اتفاق رکھنے کی بدولت چنے گئے تھے۔ [1]

بریمر نے عراق گورننگ کونسل کو ان منصوبوں کا عراقی چہرہ قرار دیا۔ ایک ایسا ڈھانچہ جسے انہوں نے یہ سوچ کر تخلیق کیا تھا کہ اس میں عراق کے تمام نسلی اور مذہبی گروہوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ ارکان کو ان کی سیاسی سوچ یا پیشہ وارانہ مہارت کی بجائے گروہی تعلقات کی وجہ سے چنا گیا تھا۔ اگرچہ اس کونسل کے پاس اختیارات بہت کم تھے لیکن اس کی ترکیب نے اس روایت کی بنیاد رکھی کہ صدام کے بعد کے عراق میں آزاد جمہوریت شناخت کے خطوط پر چلے گی۔ اس نظام میں ملک کی سیاسی اور انتظامی طاقت مذہبی اور نسلی بنیادوں پر تقسیم ہونا تھی۔

بش انتظامیہ اور میڈیا کے مرکزی دھارے سے تعلق رکھنے والے مبصرین کی طرح بریمر نے بھی فرض کر لیا تھا کہ آمریت کے عادی عراقی لوگ امریکہ کا ترتیب دیا گیا تعمیرِ نو کا منصوبہ من وعن تسلیم کر لیں گے۔ اس مفروضے میں بہت خامیاں تھیں۔ اگلے پندرہ مہینوں میں جیسے جیسے بریمر نے عراق کی تشکیل نو کا کام آگے بڑھایا، انہیں متعدد حلقوں کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بریمر کے لئے شاید سب سے زیادہ تعجب آور بات آقائے سیستانی کی ان منصوبوں کے خلاف شدید مزاحمت تھی، کہ جس

---

[1]۔ See Rajiv Chandrasekaran, Imperial Life in the Emerald City: Inside Iraq's Green Zone (New York: Vintage, 2010), for a full description of the process.

یں باقی تین مراجع ان کے ساتھ تھے۔ امید یہ تھی کہ مراجع صدیوں پرانی سکوت کی روش پر عمل پیرا ہو کر سیاست سے کنارہ کش رہیں گے۔ اس کے برعکس وہ نہایت دلچسپی سے سیاسی عمل کا جائزہ لیتے رہتے تھے اور جب ضروری سمجھتے مداخلت کرتے تھے۔ عام غلط فہمی کے برعکس مراجع صدام کے بعد کے عراق میں عوام کے حق حاکمیت، مساوات، شفافیت اور جمہوریت کے بارے میں ہونے والی بحثوں میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ [1]

اگرچہ اس باب میں ہماری توجہ آقائے سیستانی پر ہو گی لیکن باقی تینوں مراجع نے جمہوری عمل کے سلسلے میں ان کے ہر اہم فتوے اور اعلامیے کی تائید کی۔ انہوں نے آقائے سیستانی کے انتخابات اور جمہوری ریاست کے جواز کو قائم کرنے کے اقدام کے علاوہ 2014ء میں نوری المالکی کو تیسری بار انتخاب لڑنے سے روکنے جیسے فیصلوں کی تائید کی۔ اس باب میں آقائے سیستانی پر تمرکز کرنے کا مقصد قاری کو ان

[1]۔ There were some slight differences among them. They may have made statements in support of federalism, for example, in cases when Sistani had fallen completely silent, but those statements were usually qualified—for instance, "as long as it was in the interest of the national unity," as Fayyad had declared. Also, in 2014 Najafi agreed with Sistani that Maliki should not seek a third term, but he also called on his followers to support Ammar al-Hakim in the elections.

کے مدبرانہ کردار کی اہمیت کا احساس دلانا ہے۔انہوں نے ہمیشہ حوزۂ نجف کی روح اور طرز عمل کے مرکزی نمائندے کا کردار ادا کیا، اگرچہ وہ اس میں اکیلے نہ تھے۔ اس باب کو ترتیب زمانی کے ساتھ پیش کرنے کا مقصد قاری کو اس راستے کی سیر کرانا ہے جس پر چلتے ہوئے عراقی سیاست آقائے سیستانی کے گرد متشکل ہوئی۔ یہ باب اور آقائے سیستانی کا کردار قاری کو نجف اور بطور کلی عراق کی سیاسی ثقافت سے روشناس کرائے گا۔ یہ اجمالی عکاسی عراق کی جمہوریت، فرقہ بندی اور مذہبی کرداروں کے بارے میں کچھ غلط فہمیوں کے خاتمے میں مدد دیتی ہے۔اس کی بہترین مثال آقائے سیستانی کا کام ہے۔

آقائے سیستانی اور ان کے ساتھی مراجع نے سیاسی مداخلت کرتے وقت "عراقی عوام کی مرضی" کا پاس کیا، یہ اصطلاح وہ اکثر استعمال کرتے ہیں، اور اسی اصول کو انہوں نے عراق کے سیاسی عمل کی مشروعیت کی بنیاد قرار دیا۔جمہوریت کے بارے میں ان کا نظریہ نہ تو مغرب سے لیا گیا تھا نہ ہی، غیر ملکی مبصرین کی رائے کے برعکس، ایران سے لیا گیا تھا، بلکہ یہ نظریۂ جمہوریت قومی وحدت، تکثر پسندی، عوامی قبولیت، ووٹ کی تکریم اور انسانی حقوق جیسے ہمہ گیر تصورات سے مالا مال تھا۔انہوں نے بڑی دقت سے فرقہ وارانہ نظامِ حکومت کے خلاف عوامی غم و غصے کو درست سمت میں موڑ دیا۔سرانجام یہ امریکی نہیں بلکہ مراجع تھے جنہوں نے 2003ء کے بعد عراق کی نوزائیدہ جمہوریت کی پاسبانی کی۔

چنانچہ یہ باب آقائے سیستانی کے 2003ء کے بعد کے حالات میں ظاہر

ہونے والے نظریات کی لطافتوں اور باریکیوں کو نمایاں کر کے دکھاتا ہے۔ 2003ء سے 2006ء تک کے عبوری دور میں انہوں نے اس بات کو یقینی بنانے کے لئے بہت کام کیا کہ ریاست کی بنیاد مضبوط جمہوری اقدار اور روایات پر قائم ہو۔

ریاست میں تبدیلی کے موضوع پر تحقیق کرنے والے عقلاء کے ہاں عبوری دور میں "جمہوریت کا استحکام" ایک نازک تصور ہے۔ اس کی فہم پر اجماع نہیں ہو سکا ہے۔ استحکام سے میری مراد یہ ہے کہ عراق میں ادارے بن گئے تھے: ایک باقاعدہ آئین لکھا گیا تھا، نئی سیاسی جماعتیں ابھر آئی تھیں، جیسے تیسے پارلیمانی سیاست شروع ہو گئی تھی، انتخابات ہوا کرتے تھے، اور قیادت میں تبدیلی آتی رہتی تھی۔ میں اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے جمہوریت کی مضبوطی یا ریاست کے بکھرنے جیسی چیزوں کے بارے میں پیشگی کوئی مفروضہ قائم نہیں کرتی۔

میرا اس اصطلاح کو استعمال کرنے کا مقصد ان دو ادوار میں فرق کرنا ہے، ایک وہ عبوری دور کہ جب عراق امریکہ کے ماتحت تعمیرِ نو کے عمل سے گزر رہا تھا اور دوسرا وہ جب اقتدار عراقیوں کو منتقل کیا جا چکا تھا، اگرچہ امریکی فوج دسمبر 2011ء کے بعد نکلی۔ میری تحقیق 2003ء سے 2016ء کے درمیانی عرصے میں محدود ہے، اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ ریاست میں استحکام پیدا ہونے کا عمل کئی عشروں پر محیط ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ میں 2007ء سے 2009ء کے درمیان عراق میں امریکی سفیر رہنے والے ریان کروکر کے اس بیان کو سنجیدہ لیتی ہوں کہ "ہم ان کے سیاسی نظام کی بافت میں اس طرح سلے ہوئے ہیں کہ ہمارے بغیر اس نظام کا

چلنا ممکن نہ ہوگا"۔ [1]

اگرچہ آقائے سیستانی عراق کی سیاست کے سب سے طاقتور کردار ثابت ہوئے ہیں، لیکن جمہوریت پر ان کا پختہ ایمان اس بات کا سبب ہوا کہ وہ جمہوری عمل میں کبھی خلل نہ ڈالیں چاہے یہ ان کی آنکھوں کے سامنے ناکامیوں سے بھی دوچار ہوتا رہے۔

عبوری دور کا آغاز

بریمر صاحب شروع میں یہ سوچتے تھے کہ وہ عراقیوں کی اکثریت کی پرواہ کئے بغیر تعمیرِ نو کے منصوبوں پر عمل درآمد کرلیں گے۔ اس فہم کے لئے ان کا تکیہ احمد الجلبی اور ایاد علاوی جیسے سابقہ تارکین وطن کے ساتھ ساتھ کرد رہنماؤں پر تھا کہ جو نسلی اور مسلکی بنیادوں پر طاقت کی تقسیم چاہتے تھے۔ نئے نظام کی بنیاد تشخص کی سیاست پر رکھی جارہی تھی، جس میں معاہدے اور اتحاد برابر کے شہری ہونے اور قومی منصوبوں سے لگاؤ کی بجائے فرقہ وارانہ شناخت کی بنیاد پر قائم ہونے تھے۔ بریمر کے عراقی ساتھی یہ سمجھ رہے

---

[1]۔ See Sarah Childress, "Ryan Crocker: Our National Security ... Is at Stake Right Now," PBS Frontline, July 29, 2014, www.pbs.org/ wgbh/ frontline/ article/ ryan- crocker- our- nationalsecurity-is-at-stake-right-now. Empirical studies also show that it takes approximately fifty years to consider a transition fully consolidated. See, for example, Bruce E. Moon, "Long Time Coming: Prospects for Democracy in Iraq," International Security 33, no. 4 (2009): 115–48.

تھے کہ یہ نظام سنی عرب اقلیت کی آمریت کے دوبارہ آجانے کا خطرہ ٹال دے گا۔لیکن ایک دفعہ یہ نظام رسمی حیثیت اختیار کر لیتا تو یہ فرقہ وارانہ نمائندگی کو بھی رواج دیتا اور مستقبل کی سیاسی ثقافت انہی سانچوں میں ڈھلتی۔

عراق کے مستقبل کے لئے عبوری دور نہایت اہم تھا، کہ جس میں نئی ریاست کے خدوخال واضح ہونے تھے اور یہ آنے والے عشروں میں ہونے والے آئینی عمل کی آزمائش کا مرحلہ بھی تھا۔صدام کی شکست کے بعد ریاست کے پرانے اداروں کی جگہ نئے ادارے لے رہے تھے، نئی فوج اور پولیس بنانے کے ساتھ ساتھ نئے سیاسی ادارے بھی قائم ہوئے۔بریمر یہ سوچ رہے تھے کہ عراق میں ادارہ سازی مکمل ہونے سے پہلے وہ فرمان جاری کر کے حکومت چلا سکتے ہیں۔انہوں نے سی پی اے کو ملک کا نیا آئین بنانے کا اختیار سونپ دیا۔یہ متنازع اقدام تھا کیونکہ اس کے پہلے مسودے کی قابل اعتراض چیزوں میں یہ تجویز بھی شامل تھی کہ وہ جماعتیں جنہوں نے امریکی حملے کی مخالفت کی تھی، الیکشن میں شمولیت کی اہل نہ ہوں گی۔پس بریمر نے عراقیوں کی ایک مجلس بنا کر انہیں ایک قومی منشور تدوین کرنے کا اختیار دیا اور عراق کی خودمختاری کو التوا میں ڈالا۔

جونہی آئین کے بارے میں بریمر کا منصوبہ ذرائع ابلاغ میں نشر ہوا، 26 جون 2003ء کو آقائے سیستانی اپنے مشہور "جمہوری فتویٰ" کے ساتھ سیاسی منظر نامے پر نمودار ہوئے۔ان سے کچھ مقلدین نے سی پی اے کی طرف سے مجلسِ آئین ساز کے ارکان کی تقرری کی بابت سوال پوچھا تھا، جن کو تمام سماجی اور سیاسی قیادتوں سے

مشاورت کے بعد ایک مسودہ تیار کر کے ریفرنڈم کے لئے پیش کرنا تھا۔

آقائے سیستانی نے جواب میں کہا:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

ان طاقتوں کے پاس مجلسِ آئین ساز کے ارکان کی تقرری کا اختیار نہیں ہے۔اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ یہ مجلس ایک ایسا آئین تیار کرے گی جو عراقی عوام کے مفادات کے مطابق ہوگا اور عراق کی قومی شناخت، کہ جس کا انحصار دین اسلام اور اعلیٰ معاشرتی اقدار پر ہے، کی ترجمانی کرے گا۔مذکورہ منصوبہ کسی صورت قابل قبول نہیں ہے۔سب سے پہلے عام انتخابات کا انعقاد کیا جانا چاہیے تاکہ ووٹ کی اہلیت رکھنے والے ہر عراقی شہری کو یہ موقعہ ملے کہ وہ اپنی نمائندگی کے لئے تاسیسی مجلسِ آئین ساز کے رکن کا انتخاب کر سکے۔اس کے بعد تیار شدہ مسودے کو عوامی ریفرنڈم کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔ سب مومنین کو اس اہم مقصد پر اصرار کرنا چاہیے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے بہترین انداز میں کوشش کرنی چاہیے۔خدا سب کی بہتری اور سودمندی کی طرف رہنمائی کرے!

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مہر و دستخط

علی الحسینی السیستانی

26 جون 2003ء"۔ [۱]

اس فتوے میں آقائے سیستانی نے ان مراحل کی نشاندہی کی جن سے گزر کر عراق جمہوریت سے ہمکنار ہو سکتا تھا۔ انہوں نے تقرری کے بجائے براہ راست انتخابات پر زور دیا تاکہ "ہر عراقی" ایک منتخب شدہ مجلسِ نمائندگان کے لئے رائے دینے کا مجاز ہو۔ سال بھر "ایک فرد، ایک ووٹ" کے اصول پر عام انتخابات کے اسلوب پر زور دینے کا سلسلہ جاری رہا۔

عوام کی رائے کو شامل کرنے پر آقائے سیستانی کی یہ تاکید "جمہوری فتویٰ" دینے سے پہلے بھی موجود تھی۔ 3 مئی 2003ء کو جب ان سے ایسا ہی ایک سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا تھا:

"عراق میں حکومت کے نظام کا فیصلہ عوام نے کرنا ہے۔ مرجع کا ملک کی حکومت اور اقتدار میں کوئی کردار نہیں ہوگا"۔ [۲]

اور اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ شیعوں کو سی پی اے کے ساتھ تعاون کرنے کا کہیں گے، انہوں نے کہا:

"ہم ایسی حکومت بننے کا راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں جو عراقی عوام کے

---

[۱]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 35،36۔

Sistani fatwa on the mechanism of forming a constitutional council, June 26, 2003.

[۲]۔ المرجعیہ لا تمارس دوراً فی السلطہ والحکم۔

ارادے کا مظہر ہو اور تمام فرقوں اور نسلوں کو شامل کرتی ہو"۔ [1]

انہوں نے کسی ایک فرقے کو ترجیح نہیں دی نہ ہی شیعوں کی اس بنیاد پر طرف داری کی کہ وہ عددی اکثریت تھے۔ وہ صدام حسین کے زمانے میں سنی عربوں کو باقی سب پر ترجیح دینے کے آمرانہ اقدامات کے پیش نظر بہت احتیاط اور تدبر سے کام لیتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے وہ یہ سمجھتے تھے کہ صدام کا "تقسیم کرو اور حکومت کرو" والا طرز عمل اب سی پی اے کی شکل میں دوبارہ مسلط کیا جارہا تھا، جو کہ عراق پر انگریزی قبضے کی یادگار تھا۔

آقائے سیستانی کے ان بیانات کا ڈرامائی اثر ہوا۔ انہوں نے اہم جمہوری بیانیے کو عوامی حلقوں میں زیر بحث بنادیا اور اکثر اوقات بریمر کے منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔ بریمر کا ہر اہم فرمان پر دستخط کرنے کا خصوصی اختیار صدام حسین کے اس مشہور قول کی یاد دلاتا تھا کہ "اگر میں کاغذ پر لکھ دوں تو وہ قانون ہوگا"۔ [2]

ایک وائسرائے کے طور پر بریمر ایک دستخط کے ساتھ پرانے قوانین کو منسوخ

---

[1]۔ (الذی نریدہ هو ان یفسح المجال لتشکیل حکومة منبعثة من ارادة الشعب العراقی بجمیع طوائفه واعراقه [النصوص الصادرہ، صفحہ 22،23])۔

Sistani fatwa in response to Associated Press questions, May 3, 2003.

[2]۔ The HBO documentary series House of Saddam has many notable quotations attributed to Saddam Hussein. This was among the most memorable ones.

اور نئے قوانین کا اطلاق کرسکتا تھا[۱]۔عراقی عوام آمرانہ متلون مزاجی کے عادی تھے لیکن آقائے سیستانی جمہوری آئین کی پابند حکومت (مشروطہ) قائم کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ آمریت کے خاتمے کے لئے انہیں سیاسی رقابت اورعوامی شمولیت،سماجی ذمہ داریوں،موثر انتخابات اورنئی ریاست کی عوامی مقبولیت پرزوردینا اوران میں التوا کی صورت میں پیدا ہونے والے خطرات سے آگاہ کرتے رہنا تھا۔

ریاست میں تحول پر تحقیق کرنے والے عقلاء کے روایتی خیال کی پیروی کرتے ہوئے بریمر یہ سمجھ رہے تھے کہ جمہوریت کی طرف جانے میں انتخابات سے آغاز کرنا خطرناک ہو گا۔ بریمر کا منصوبہ ایک فری مارکیٹ والی سرمایہ دارانہ جمہوریت قائم کرنا تھا۔بریمر کے اقدامات میں ریاستی کاروباروں کوعوامی ملکیت میں دینے کی تجویز بھی شامل تھی۔انہوں نے کہا:"اگر ہم ان کی معیشت کی اصلاح نہ کریں تو ہمارے سیاسی تحول کے منصوبے جتنے بھی اچھے ہوں،کام نہیں کریں گے۔" انہیں ایک فری ٹریڈ زون بنانے کا خیال بھی تھا جس سے عالمی برادری کو فائدہ ہو۔ مجوزہ نمونے میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ ایک نئی تاجر برادری کی مدد سے سرمایہ داری کی طرف حرکت ایک متوسط طبقہ پیدا کرنے کو یقینی بنائے گی۔ یہ طبقہ سیاسی اصلاحات اور جمہوریت کے قیام میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔انتخابات کے بجائے بازار کو اہمیت دی جارہی تھی۔[۲]

---

[۱]۔ Chandrasekaran, Imperial Life, 70–71.

[۲]۔ Ibid., 70.

اس عمل کے نتیجے میں، کہ جسے سیموئیل ہنٹنگٹن نے جمہوریت کی تیسری لہر کہا تھا، 1990ء کی دہائی تک دنیا میں سو کے قریب نوزائیدہ جمہوریتیں وجود میں آچکی تھیں۔ان سب میں انتخابات ہوتے تھے لیکن وہ "آزاد جمہوریتیں" نہیں تھیں کیوں کہ ان میں مہذب آزادیوں اور انسانی حقوق کا کما حقہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔فرید ذکریا جیسے نقادوں نے اس نکتے کو اٹھایا کہ انتخابات پر زور دینے سے ترقی پذیر دنیا میں "بے روح جمہوریت" کو فروغ ملتا ہے۔پس انتخابات کو التواء میں ڈالنا ہوگا۔یہ بیانیہ غیر سیاسی آزادیوں کا احترام کرنے والی آمریت کو ایسی جمہوریت پر فوقیت دیتا تھا جس میں مہذب آزادیوں پر قدغن لگائی جائے۔ذکریا نے آگے چل کر کہا کہ سعودی عرب کی طرح کی ریاستوں کو یکدم جمہوری بنانے کا نتیجہ "جیفرسن کی جمہوریت" نہیں بلکہ "طالبان کی ملائیت" ہوگا۔انہوں نے عرب حکمرانوں کو آمر قرار دیا لیکن ایسے آمر جو انتخابات سے برآمد ہونے والے حکمران سے زیادہ لبرل، بردبار اور تکثر پسند تھے۔انہوں نے خاص طور پر اس خدشے کی نشاندہی کی کہ اخوانی جماعتیں انتخابات میں شامل تو ہوں گی لیکن ان کو جمہوریت کے بغض میں "ایک ووٹ، ایک بار" کا نمونہ بنا کر رکھ دیں گی۔عبوری دور سے گزرنے والے معاشروں کی مثال کے طور پر انہوں نے بوسنیا کی صورت حال کو آزادیوں کی ضمانت دینے والی جمہوریت کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا جہاں ڈیٹون کے امن معاہدے کے ایک سال بعد لوگ ووٹ دینے گئے اور اس عمل کا نتیجہ نسلی تعصبات کو بڑھاوا دینے کی صورت میں نکلا۔انہوں نے کہا کہ مشرقی تیمور اور افغانستان میں قومی ریاست کی تشکیل کو لمبے عرصے تک طول دینے کا

عمل ایک بہتر نمونہ ہے۔انہوں نے عبوری دور کے لئے پانچ سال تجویز کئے جن میں سیاسی اصلاحات اور اداروں کی تعمیر کا عمل مکمل کیا جائے اور پھر قومی سطح پر کثیر الجماعتی انتخابات کرائے جائیں [1]۔ وہ عراق میں التواء کے قائل تھے، جسے مقامی آبادی اور عراق کے امور کے ماہرین مسائل کی جڑ سمجھ رہے تھے۔زکریا کے موقف کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ مغربی دنیا میں فردی آزادیوں اور جمہوریت کے درمیان ایک مضبوط تعلق بن چکا تھا جو دنیا کے دوسرے حصوں میں وجود نہیں رکھتا تھا۔

یہ محتاط سوچ امریکی حلقوں میں عام تھی اور ریاست میں تبدیلی کے عمل کے آقائے سیستانی کی خواہش کے مطابق مکمل طور پر عراقی بننے میں رکاوٹ تھی۔مثال کے طور پر ایک سابقہ انتظامی عہدیدار نے کسی نجی بیان میں کہا تھا کہ وائٹ ہاؤس کردوں اور سنی عربوں کو ویٹو کی طاقت دے کر عراق میں شیعہ ملائیت (ولایتِ مطلقۂ فقیہ) کا راستہ روکنا چاہتا ہے۔اس نے کہا، "یہاں جیفرسن کی جمہوریت نہیں بننے والی" اور "یہ سوچنا حماقت ہوگی کہ عراقی لوگ (اخوانی) اسلام کی ملاوٹ کے بغیر ایک آئین لکھ سکتے ہیں اور ایک جمہوریت بنا سکتے ہیں۔" [2] پس اگرچہ علمی حلقوں میں فرید زکریا کے تصور کا بہترین انداز میں رد کیا جا چکا تھا، لیکن ہنوز مقتدر حلقوں میں اور عملی میدان میں یہ احساس

---

[1]۔ See Fareed Zakaria, "Islam, Democracy, and Constitutional Liberalism," Political Science Quarterly 119, no. 1 (2004): 1–20. This cautious discourse was prevalent in US circles.

[2]۔ Edward Wong, "Leading Shiite Clerics Pushing Islamic Constitution in Iraq," New York Times, February 6, 2005.

حاوی تھا کہ آزادی ناکام ہو جائے گی۔مفروضہ یہ تھا کہ عراق کی شیعہ اکثریت کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو وہ ایک اخوانی سیاست دان کے پیچھے لگ کے ایک "بے روح جمہوریت" قائم کریں گے۔وہ اس بات سے غافل تھے کہ وہاں طاقت کسی ایک جگہ مرکوز نہ تھی اور اگرچہ شیعوں میں اخوانی سیاسی عزائم رکھنے والی جماعتیں تھیں لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ سب ایک ہی ہدف رکھتی تھیں۔تعمیرِ نو کے سارے منصوبوں پر انسداد کی سوچ چھائی ہوئی تھی۔اس میں شیعیت کو یکساں اور بسیط فرض کیا گیا تھا اور یہ سمجھا جارہا تھا کہ شیعوں کی سب جماعتیں (اخوان المسلمین کی طرح) مذہبی عقائد کا سیاسی استعمال کرتی تھیں۔ان خیالات کو سمجھنے کے لئے خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔خاص طور پر "بے روح جمہوریت" کی بار بار دہرائی جانے والی بات کہ جس میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ شیعہ تحرک "تھامس جیفرسن کی جمہوریت" کا الٹ ہے، کئی مغالطے لئے ہوئے ہے۔

کیا عراقی عوام امریکہ دشمنی پر مبنی ایرانی نظام کو اپنا لیں گے؟ کیا وہ اقلیتوں کے حقوق کا احترام کریں گے؟ ممکن ہے کہ بریمر کے ذہن پر یہ سوال چھائے ہوں لیکن آقائے سیستانی ان پر غور کرنے کو تیار نہ تھے۔آقائے سیستانی کا انتخابات کے بارے میں عقیدہ، جسے انہوں نے عوامی مقبولیت کے ساتھ بھی جوڑ دیا، ان محققین کی آراء سے ہم آہنگ تھا جو جمہوری عمل کا دوسرا رخ دیکھ رہے تھے۔مثلاً مارک پلاٹنر صاحب کا کہنا تھا کہ جمہوریت اور مہذب آزادی میں تاریخی طور پر کوئی رشتہ وجود نہیں رکھتا ہے۔مہذب آزادیوں کے احترام کے نظریئے کی جائے پیدائش جدید انگلستان ہے کہ جس میں انیسویں صدی تک ووٹ ڈالنا ایک بڑے محدود حلقے کا حق سمجھا جاتا

تھا۔ پلاٹنر صاحب جان لاک کی کتاب "سیکنڈ ٹریٹائز آف گورنمنٹ" کو انسانی مساوات اور اکثریت کی رائے کے احترام پر زور دینے کی وجہ سے فردی آزادیوں کے احترام کی سوچ کا مصدر مانتے ہیں۔پس سیاسی طاقت کا مأخذ آزادی اور برابری سے ہمکنار ہونے والے افراد کی رضایت ہے۔لاک کے فکری نظام میں سیاسی ڈھانچے اور طرزِ حکومت کے انتخاب میں سب کی مرضی شامل ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مہذب آزادی کا نظریہ "عوام کی حاکمیت پر بے چوں و چرا یقین رکھتا ہے"، یہی نکتہ آقائے سیستانی بار بار اٹھا رہے تھے [۱]۔ پلاٹنر صاحب انتخابات کی بنیاد رکھنے پر زور دیتے ہیں کیوں کہ کلی طور پر جن ممالک میں انتخابات باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں وہ فردی آزادیوں کے احترام میں ان سے بہتر ہیں جن کے ہاں ایسا نہیں ہوتا، اور جن ممالک میں سماجی آزادیوں کا احترام کیا جاتا ہے ان میں انتخابات میں دھاندلی کا امکان بھی کم ہوتا ہے۔وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب جمہوری ادارے بن جائیں تو مہذب آزادی اور انتخابی جمہوریت میں ایک اٹوٹ رشتہ اور قریبی تعلق قائم ہو جاتا ہے۔[۲] ریاستوں کو جمہوریت کی منزل حاصل کرنے کے لئے مغرب کے راستوں پر چلنا ضروری نہیں ہے۔ پلاٹنر صاحب کو اس بات سے اتفاق نہیں تھا کہ کچھ خاص عبوری مراحل میں مغربی ممالک کو "مرحلہ وار جمہوریت" کی حمایت کرنی چاہیے۔کسی اصول کے تحت بھی

---

[۱]۔ Marc Plattner, "Liberalism and Democracy: Can't Have One Without the Other," Foreign Affairs 77, no. 2 (1998): 174.

[۲]۔ Ibid., 171–80.

انتخابات پر قدغن کو قبول نہیں کیا جا سکتا اور انتخابات کے سوا حکمران کے تعین کا کوئی اور جائز طریقہ نہیں ہے۔اسی طرح اس مفروضے کی بھی کوئی بنیاد نہیں کہ اگر مسلمان معاشروں کو آقائے سیستانی کے بتائے ہوئے طریقے پر اپنے ادارے بنانے کی آزادی دی جائے تو وہ انسانی حقوق کے تحفظ کو ووٹ نہیں دیں گے یا شخصی آزادیوں کے تحفظ کی طاقت نہیں رکھتے ہوں گے۔ان بحثوں سے مستشرقین کے تعصب کی بو آتی ہے اور اس لب و لہجہ کی جو برطانوی استعماری دور کی پالیسی ساز گرٹروڈ بیل نے اپنے باپ کے نام خط میں استعمال کیا ہے کہ اقتدار ان "عجیب و غریب لوگوں" کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔آقائے سیستانی اس قسم کے مفاہیم کے دوبارہ احیا کے خلاف ڈٹ گئے۔

2 جولائی 2003ء میں آقائے سیستانی ایک بار پھر سیاسی منظر نامے پر ظاہر ہوئے اور انتخابات کے طریقۂ کار کے بارے میں ایک مفصل بیان جاری کر کے متحیر کر دیا۔جون میں جاری کئے گئے فتوے کے ضمن میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ ووٹ دینے والوں کی اہلیت اور نمائندگان کے انتخاب کے بارے میں وہ کیا کہنا چاہیں گے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ مجلسِ آئین ساز کے ارکان "ووٹ کی اہلیت رکھنے والے عراقی شہریوں کی مرضی سے منتخب ہونے چاہئیں" اور یہ کہ "ووٹنگ کی شرائط و مقررات کا تعین کر کے سب پر شفاف انداز میں ایک جیسا اطلاق کیا جائے۔" آگے چل کر انہوں نے کہا کہ مشرقی تیمور میں اقوامِ متحدہ کی زیرِ نگرانی اسی قسم کے انتخابات کا انعقاد کیا گیا تھا اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ "عراق کے معاملے میں اس قسم کا بندوبست کیوں نہیں کیا جا سکتا؟" انہوں نے واضح کیا کہ "بلا واسطہ انتخابات کا کوئی نعم البدل نہیں ہو

سکتا۔" آئین کی اشاعت کے بعد انتخابات ہونے کا انتظار کرنا ممکن نہیں ہو گا کیوں کہ ایک ایسی مجلس کے ہاتھوں لکھا گیا آئین "جو عوام کی طرف سے منتخب نہیں کی گئی، قابل قبول نہیں ہو گا۔" انھوں نے کہا کہ ان کا کام تو بس "عراقی عوام کو کسی تاخیر یا لیت و لعل کے بغیر حق حکمرانی واپس دلوانے کا راستہ ہموار کرنا ہے"۔ [1]

آقائے سیستانی کے فتوے سے بریمر کے قدم لڑکھڑا گئے، اگرچہ وائسرائے کو آقائے سیستانی کی غیر رسمی طاقت کا درست اندازہ لگانے میں کئی ماہ اور لگے۔ 13 جولائی 2003ء میں سی پی اے نے پچیس ارکان پر مشتمل عراقی گورننگ کونسل کا اعلان کیا جسے عراقی ریاست کی تعمیرِ نو کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس میں ملک کے بڑے نسلی اور مذہبی گروہوں کی نمائندگی تھی (تیرہ شیعہ، پانچ سنی عرب، پانچ سنی کرد، ایک آشوری مسیحی اور ایک ترکمانی)۔ بعد میں تین خواتین کو بھی شامل کیا گیا۔ اگرچہ اس کا مقصد عراقی عوام کی نمائندگی کرنا تھا، اس میں فرقہ وارانہ اور نسلی تنوع کی عکاسی کی گئی۔ مزید یہ فرض کیا گیا تھا کہ سیاسی نمائندگی یوں حصوں میں بٹی ہونی چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ عراقی گورننگ کونسل دراصل عراق کے بارے میں خود عراقی عوام کے بجائے سی پی اے کے زاویہ نگاہ کی ترجمانی کرتی تھی۔ شاید بریمر کا خیال تھا کہ اس طرح کی "نمائندہ" مجلس ایک مقبول بندوبست ہو گی۔ وہ شدید غلط فہمی کا شکار ہوئے تھے۔ پچیس میں سے چوبیس ارکان آقائے سیستانی سے ملنے نجف چلے گئے اور ہر ایک نے ان کی اس بات کو مان لیا کہ انتخابات

---

[1]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 41،40۔

Sistani response to Los Angeles Times questions, July 2, 2003.

سے پہلے کوئی عبوری آئین نہ لکھا جائے۔

آقائے سیستانی اور دوسروں کے دباؤ کے نتیجے میں بریمر کو یہ ماننا پڑا کہ عراقی گورننگ کونسل محض ایک عبوری حکومت ہوگی جس کا کام موقت طور پر انتظامی معاملات کو سنبھالنا اور سی پی اے اور اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندوں کے ساتھ ایک مشاورتی اور تعاونی کردار ادا کرنا ہوگا۔ سی پی اے کے چھٹے فرمان کے مطابق سی پی اے اور عراق گورننگ کونسل کو تمام معاملات میں باہمی تعاون اور مشاورت سے چلنا تھا۔ عراقی گورننگ کونسل، جو بظاہر عراق کی آبادی کی نمائندگی کرتی تھی، نے انتخابات کے انعقاد، آئین لکھے جانے اور مستقل حکومت کے بننے تک ملک کا انتظام سنبھالنا تھا۔ لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ ایسے مقبول ادارے بنانا مشکل تھا جن کی جڑیں عراقی معاشرے میں پیوست ہوں اور امریکی تسلط کے زیر سایہ ریاست سازی کا عمل مشکلات میں گھرا رہے گا، اور اس پہ طرّہ یہ کہ آقائے سیستانی ان مسائل پر نکتہ چینی کریں گے۔ اگرچہ رسمی طور پر طاقت بریمر کے ہاتھ میں تھی لیکن غیر رسمی سیاست ان سوالوں کے گرد گھومتی تھی۔

آقائے سیستانی کی دلچسپی نئی ریاست کی عوامی مقبولیت میں تھی۔ جیسا کہ اپنی کتاب کے چوتھے باب میں میں اشارہ کر چکی ہوں، وہ سیاست کی تفصیلات سے خود کو دور رکھتے تھے، اور امریکہ، کہ جس کو ہمیشہ وہ "قابض طاقت" کہتے تھے، سے بھی فاصلہ قائم رکھتے تھے۔ اس عرصے میں ان سے سوال کیا گیا کہ کیا انہیں عراقی گورننگ کونسل میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے اور کیا وہ امریکہ سے مذاکرات کر رہے ہیں؟ ان کے دفتر نے اس کونسل میں شرکت کے امکان کو رد کیا اور کہا کہ "مرجع عالی اور قابض

حکومت کے درمیان اس کونسل کی تشکیل یا عراق سے تعلق رکھنے والے کسی موضوع پر کوئی رابطہ نہیں ہے" اور یہ کہ ان تک اس کونسل کے بارے میں "کوئی معلومات نہیں پہنچائی گئیں"۔ [۱]

دوسرے بیانات میں آقائے سیستانی نے کہا کہ وہ "امریکہ کے مقاصد کے بارے میں تشویش کا شکار ہیں"۔ [۲]

جب بھی پوچھا گیا کہ کیا انہوں نے بش انتظامیہ سے بات چیت کی ہے تو ان کا جواب نفی میں تھا۔ درحقیقت انہوں نے کبھی امریکہ کا نام استعمال نہیں کیا بلکہ ہمیشہ "قابض طاقت" یا "قابض حکومت" کی اصطلاح استعمال کی۔انہوں نے کئی مواقع پر واضح کیا کہ یہ القاب ان کا فتویٰ نہیں تھے بلکہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی رسمی اصطلاحات تھیں (جنہیں بریمر بھی استعمال کرچکے تھے)۔ [۳]

وہ اکثر امریکی اقدامات پر تبصرہ کرنے یا امریکیوں کو اپنی غلطیوں کی اصلاح پر مشورہ دینے سے گریز کرتے تھے۔وہ امریکہ کے بارے میں بہت کم بولے،اسی طرح

---

[۱]۔ النصوص الصادرہ،صفحہ 42۔

Sistani response to French newspaper questions, July 14, 2003.

[۲]۔ النصوص الصادرہ،صفحہ 33۔

Sistani response to Washington Post questions, June 20, 2003.

[۳]۔ النصوص الصادرہ،صفحہ 45۔

Sistani response to Japanese newspaper questions, July 19, 2003.

جیسے انہوں نے مقتدیٰ الصدر یا جہادی گروہوں کو رسمی شناخت دینے سے انکار کیا تاکہ وہ اپنی حد میں رہیں۔

آقائے سیستانی کی فکر میں اقوام متحدہ کا ادارہ کافی نمایاں ہے۔ [۱]

اپنے تمام بیانات میں آقائے سیستانی نے واضح کیا کہ "عبوری دور میں عراق کے امن اور استحکام کی ذمہ داری اقوام متحدہ پر ہے" اور یہ کہ عراقیوں کو اپنے ملک پر "حق حاکمیت" لوٹانے کو ممکن بنانے کے مراحل پر "نظارت" اور "نگرانی" کے سلسلے میں اس ادارے کا کردار بہت اہم ہے۔ [۲]

انہوں نے ہمیشہ تصریح کی کہ عراق میں موجود تمام افواج کو "اقوام متحدہ کی چھتری تلے" ہی کام کرنا چاہئیے۔ [۳]

چونکہ سلامتی کونسل نے حملے اور قبضے کی اجازت نہیں دی تھی، لہذا آقائے سیستانی کیلئے اس بات کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ اقوام متحدہ نے بعد میں عراق میں اپنے اہلکار

---

[۱]۔ عرض مترجم:

اس کی وجہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ بین الاقوامی امورِ حسبہ کی مدیریت کرتا ہے۔

Quoted in Sistani's condolence letter to the secretary-general of the United Nations on the assassination of the representative in Iraq, Sergio Vieira de Mello, August 20, 2003.

[۲]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 58۔

Sistani response to Le Nouvel Observateur questions, August, 29, 2003.

[۳]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 65۔

بھیجے۔ جب بھی ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ امریکی موجودگی کی تائید کرتے ہیں تو وہ کہتے "ہم کیسے قبضے کی تائید کر سکتے ہیں؟"[۱]۔ اور یہ کہ وہ امریکی افواج اور اس کے اتحادیوں، جیسے پولینڈ، کی افواج میں "کسی فرق کے قائل نہیں ہیں"۔[۲]

یہ سب عراق کے لئے اس وجہ سے اجنبی تھے کہ یہ ایک ایسے فوجی حملے کا حصہ بنے جسے آقائے سیستانی خود اور عالمی برادری ناجائز سمجھتی تھی۔ جب عراق میں جاپانی فوج کی ممکنہ آمد کے بارے میں سوال کیا گیا تو آقائے سیستانی نے جواب میں کہا:

"عراقی عوام اس کی آمد کو اسی صورت خوش آئند سمجھ سکتے ہیں اگر یہ عمل اقوام متحدہ کی چھتری تلے انجام دیا جائے" اور اگر یہ "عام انتخابات کے لئے حالات کو سازگار بناتی ہیں"۔[۳]

آقائے سیستانی نے ہمیشہ اقوام متحدہ کو قانونی اعتبار کی علامت کے طور پر پیش کیا۔ آقائے سیستانی سے بارہا عراق سے امریکی افواج کے انخلا کے وقت اور اس میں اقوام متحدہ کے کردار کے بارے میں سوال کیا گیا۔ وہ معمولاً اس بات سے آغاز کرتے کہ

---

[۱]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 71۔

Sistani response to Polish Weekly questions, September 26, 2003.

[۲]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 63۔

Sistani response to Kzata Hiebauracha al-Belenah questions, August 25, 2003.

[۳]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 47۔

(لیکن جاپان نے بھی اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر اپنے دستے بھیجے)۔

Sistani response to Japanese Economy questions, July 28, 2003.

روزِ اول سے ہی امریکی موجودگی ناجائز تھی، جس کی وجہ سے کسی بھی دورانیے کا قبضہ جائز نہیں ہے۔ اگر ملک کے تحفظ کے لئے بیرونی افواج کی ضرورت ہے تو آقائے سیستانی کے نزدیک یہ کام اقوام متحدہ کے "زیرِ سایہ" ہونا چاہیئے۔ [۱]

اس کے علاوہ کوئی طریقہ جائز نہ ہوگا۔ وہ عراق میں فرانس کے کردار سے راضی تھے کہ انہوں نے اقوام متحدہ کے راستے سے کام کیا تھا جو ان کے مطابق "عراقی عوام کے مفادات سے ہم آہنگ تھا"۔ [۲]

پروفیسر جولیون ہوورث نے بھی فرانس کو اس کی عالمی معاہدے کرنے کی صلاحیت اور اقوام متحدہ کی مرکزیت پر زور دینے اور عراق پر حملے سے پہلے تفتیش کے عمل کیلئے عالمی برادری کی حمایت اکٹھی کرنے کی وجہ سے "بین الاقوامی قانون کا مدافع" قرار دیا تھا۔ [۳]

آقائے سیستانی نے عراق کی بابت اقوام متحدہ کی ذمہ داریوں پر بھی بہت توجہ

---

[۱]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 65۔

Sistani response to Le Nouvel Observateur questions, August, 29, 2003.

[۲]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 65۔

_Ibid.

[۳]۔ Jolyon Howorth, "France: Defender of International Legitimacy," in The Iraq War: Causes and Consequences, ed. Rick Fawn and Raymond Hinnebusch (Boulder, CO: Lynne Rienner, 2006), 49. After the war began, France pressed the case for UN legitimization and oversight of the process of transition to democracy in Iraq.

دی۔ انہوں نے یہ استدلال قائم کیا کہ چونکہ اقوام متحدہ نے نئی عراقی ریاست کو تسلیم کرلیا تھا، اسے یہاں کے سیاسی عمل پر اس وقت تک نظارت بھی کرنی چاہیئے جب تک اس کو استحکام اور عوامی مقبولیت حاصل نہ ہو جائے۔ [۱]

یہاں اور دوسرے مواقع پر ان کی زبان میں ابہام تھا لیکن ایک خاص منطق ان کے بیانات میں مشترک تھی: مشروعیت تبھی حاصل ہو گی جب سیاسی ڈھانچہ "ہر فرقے اور نسل سے تعلق رکھنے والے عراقیوں کی منشا" کے مطابق قائم ہو جائے گا۔ [۲]

عراق کی خودمختاری کی طرف سفر

نومبر 2003ء میں سی پی اے نے عراق کی خودمختاری کی طرف حرکت کا منصوبہ پیش کیا۔ 15 نومبر کو جس معاہدے پر دستخط کئے گئے اس میں ٹرانزیشنل ایڈمنسٹریٹو لاء (عبوری انتظامی دستور) کا مسودہ بھی شامل تھا جو ایک موقت قانون تھا، اور عراق کے ہر صوبے میں ایک رائے شماری کی تجویز تھی تاکہ عبوری پارلیمان بنائی جائے۔ وہ پارلیمان جون 2004ء کو عبوری حکومت کا سربراہ چنے گی۔ آقائے سیستانی نے تشویش کا اظہار کیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ معاہدے سے قبضے کے تسلسل کا تاثر ملتا تھا جس کا مطلب اسے جائز ماننا بھی تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ عبوری پارلیمان انتخابات کے

[۱]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 101۔

Sistani response to Der Spiegel questions, February 15, 2004.

[۲]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 22۔

Sistani response to Associated Press questions, May 3, 2003.

بجائے رائے شماری سے چنی جانی تھی۔ آقائے سیستانی نے جون میں فتویٰ دے کر انتخابی جمہوریت کی بات تو منوالی تھی لیکن بریمر اس فتوے میں موجود طریقہ کار پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ [1]

آقائے سیستانی نے کئی پیغامات میں بلاواسطہ عام انتخابات کے طریقے پر زور دیا تھا لیکن بریمر سن نہیں رہے تھے، یا یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ جو چاہیں گے کر لیں گے۔ اب آقائے سیستانی کو یہ پریشانی لاحق ہوگئی کہ رائے شماری سے اس قسم کے افراد چنے جاسکتے ہیں جو" قوم کے منتخب کردہ بچے" نہ ہوں۔ انہوں نے اس اصطلاح کے ساتھ "بیلٹ باکس" کی اصطلاح پر زور دینا شروع کر دیا تاکہ ریاست کی تشکیل کے عمل میں سابقہ تارکین وطن کے غیر متناسب اثر و رسوخ اور ایک غیر ملکی قابض قوت کے تسلط کو

---

[1]۔ Bremer's plan entrusted the council to craft a "basic law" that would lay the groundwork for the formation of a transitional government. Moreover, each of Iraq's eighteen provinces would hold conventions to elect members to an interim parliament. This parliament would elect a prime minister, based on a proportional system of representation. The IGC would hold elections for constitution drafters, as Sistani's June fatwa dictated, followed by formal elections, the turnover of power to a new government, and the transition from the interim constitution to the permanent one. By this time, the CPA would be dissolved, although the US military would remain on Iraqi soil.

نمایاں کریں۔ آقائے سیستانی نے کہا کہ "یہ طریقۂ کارنا جائز ہے"۔ [1]

مقامی جمہوریت کا بیانیہ ان کا بہترین ہتھیار ثابت ہوا۔ [2]

آقائے سیستانی نے "ایک فرد، ایک ووٹ" کے نظام کا مطالبہ کیا جس میں اظہار رائے کا میدان وسیع تر ہوگا جو اس اہم عبوری دور کے لئے ضروری ہے۔ 27 نومبر 2003ء کو آقائے سیستانی نے عوام کے حق خود ارادیت کے بارے میں اپنا فتویٰ ایک صحافی انتھونی شدید کو دیا: "عبوری مقننہ کے ارکان کے چناؤ کا طریقہ ایک ایسی پارلیمان کی تشکیل کو یقینی نہیں بنا سکتا جو عراقی عوام کی صحیح نمائندگی کر سکتی ہو۔" انہوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ طریقۂ کار کو "ایک ایسے طریقے سے بدلنا چاہیے جو اس

---

[1]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 53۔

Sistani response to Indian Pioneer questions, August 14, 2003.

[2]۔ Sistani repeated versions of the need for direct elections to reporters on different occasions: response to San Francisco Times, July 14, 2003; response to Asahi, July 19, 2003; response to Japan Times, July 28, 2003; response to New York Times, July 28, 2003; response to Los Angeles Times, August 2, 3003; response to Indian Pioneer, August 14, 2003; response to al-Hayat and LBC, August 17, 2003; response to Le Nouvel Observateur, August 29, 2003; This is just a sampling of the international appeal of and interest in Sistani's position.

کو یقینی بنائے، یعنی انتخابات!" صرف یہی چیز ایک ایسی پارلیمان کے وجود میں آنے کی یقین دہانی کرا سکتی ہے جو" عراقی عوام کے ارادے کا مظہر ہوگی اور ان کی صحیح انداز میں نمائندگی کر سکتی ہوگی اور اسی طرح اس کی مشروعیت کا بھی تحفظ ہوگا"۔ [۱]

اسی فتوے میں آقائے سیستانی نے انتخابات میں ووٹرز کے شناختی کارڈ نہ ہونے کی صورت میں ان کے راشن کارڈ کو شناخت کے لئے استعمال کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

15 نومبر کے معاہدے پر قائم رہتے ہوئے امریکہ نے کہا کہ ایسے آزاد اور شفاف انتخابات کی تیاری کے لئے وقت کافی نہیں ہے جو 30 جون 2004ء سے پہلے اقتدار ایک عبوری عراقی حکومت کے حوالے کرنے کو ممکن بنا سکیں [۲]۔ آقائے سیستانی نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان سے رائے طلب کی۔ اقوام متحدہ، واحد بیرونی ادارہ جس کی مداخلت کو آقائے سیستانی (بین الاقوامی مقننہ کے طور پر) جائز اور منصفانہ سمجھتے تھے، کو دعوت دے کر انہوں نے تدبر کا مظاہرہ کیا جس نے

---

[۱]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 84۔

Sistani response to Washington Post questions, November 27, 2003. For discussion of this fatwa, see also Anthony Shadid and Rajiv Chandrasekran, "Cleric Renews Calls for Iraq Elections," Washington Post, November 29, 2003.

[۲]۔ Pamela Hess, "Iraqi Sovereignty on Ambitious Schedule," United Press International, November 17, 2003, www.upi.com/ Iraqi- sovereignty- on- ambitious- schedule/ 90261069111918.

انہیں دلیل کے محاذ پر پیش قدمی کرنے میں واشنگٹن پر فوقیت دی۔ بریمر کو بھی معلوم تھا کہ عراق میں قومی ریاست بنانے کے عمل میں وہ اقوام متحدہ سے بے نیاز نہ تھے۔ درحقیقت عراق پر حملے کے وقت اقوام متحدہ کی مخالفت کرنے کے باوجود اب امریکہ کو اس عالمی ادارے کی طرف واپس آنا پڑا تھا، جزوی طور پر اس لئے کہ بہت سے ملک عراق میں نئی قومی ریاست بنانے کے عمل میں اقوام متحدہ کی قرارداد کے بغیر شامل ہونے پر رضامند نہ تھے۔ لیکن آقائے سیستانی سی پی اے پر دباؤ ڈال کر یہ بات سامنے لانا چاہتے تھے کہ سی پی اے انتخابات کروانا ہی نہیں چاہتی۔ وہ مسلسل عبوری حکومت کے ناجائز ہونے اور مقامی حمایت سے محروم ہونے جیسی حقیقت کو بیان کرتے رہے۔ اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کوفی عنان آقائے سیستانی کے نام عراقی گورننگ کونسل کے صدر عدنان پچاچی کے ہاتھوں ایک خط ارسال کر چکے تھے جس میں انہوں نے جلدی انتخابات کروانے کی مخالفت میں مشورہ دیا تھا۔ آقائے سیستانی کے لئے کسی تحقیقاتی کمیشن بنائے اور معاملے کو پرکھے بنا دیئے گئے مشورے کی کوئی حیثیت نہ تھی چاہے اسے اقوام متحدہ نے ہی تیار کیا ہو۔ انہوں نے اقوام متحدہ پر مزید کچھ کرنے کے لئے دباؤ ڈالا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ سی پی اے کو مجبوراً اقوام متحدہ کے وفد، جس کی قیادت لا خضر براہیمی کر رہے تھے، سے پوچھنا پڑا کہ عبوری حکومت کے لئے جلد انتخابات کے امکان پر اپنی رائے دیں۔ آقائے سیستانی نے نہ صرف امکان کا علمی جائزہ لئے جانے کا مطالبہ کیا بلکہ وفد سے چاہا کہ "سب پہلوؤں پر تحقیق کریں" اور عبوری قومی کونسل میں عراقی عوام کی نمائندگی کے

لئے "متبادل طریقہ کار وضع کریں"۔ [۱]

بریمر کو بھی انتخابات کو 30 جون تک ملتوی کرنے کے لئے اقوام متحدہ کی حمایت درکار تھی۔ بڑے پیمانے پر تحقیق کرنے کے بعد لاخضر براہیمی نے نتیجہ نکالا کہ انتخابات سال 2004ء کے اواخر یا سال 2005ء کے اوائل میں ہی منعقد ہو سکتے ہیں۔ آقائے سیستانی نے فیصلے کو قبول کرلیا۔ اپنے بیان میں انہوں نے کہا: "(اقوام متحدہ کی) رپورٹ نے جامع حکومت کے قیام کا راستہ ہموار کر دیا ہے جو بلا واسطہ قومی انتخابات پر مبنی ہوگی"۔ آگے چل کر انہوں نے کہا کہ اس رپورٹ نے 15 نومبر کے معاہدے میں موجود "اہم نقائص" کی نشاندہی کی، اور پھر انہوں نے ان نقائص کو ایک ایک کرکے لکھ دیا۔ انہوں نے نتیجہ نکالا کہ اب عبوری حکومت کا کام عارضی قوانین بنانا رہ گیا تھا اور یہ "غیر منتخب سرکار" 2005ء کو ختم ہو جائے گی۔ [۲]

انہوں نے اقوام متحدہ سے اس عمل پر نظارت کی ضمانت حاصل کرلی۔ اس بیان نے اس بات کو بھی یقینی بنا دیا کہ امریکی اقدامات کی بابت اقوام متحدہ کی تشخیص عوام میں نشر ہو جائے۔ تاہم آقائے سیستانی حد سے زیادہ مخالفت نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت

---

[۱]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 86۔

Sistani response to CNN questions, January 5, 2004.

[۲]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 106۔

Sistani statement on the report issued by the UN International Commission assigned to retrace the facts in Iraq, February 25, 2004.

انہوں نے امریکہ کے ریاست سازی کے منصوبے کو سبوتاژ نہ کر کے ایک اعتبار سے اس کی مدد بھی کی۔ جس وقت انہوں نے اقوام متحدہ کی سفارشات کو منظور کیا، بصرہ میں عوام ان کے جلد انتخابات کروانے کے مطالبے کے حق میں مظاہرہ کر رہے تھے۔ کئی مظاہرین نے بینروں پر" کلا کلا امریکہ" کے نعرے لکھ رکھے تھے۔ اس اعلان سے پہلے آقائے سیستانی کے دفتر کے ایک عہدیدار نے امریکیوں سے کہا تھا کہ وہ مجوزہ عبوری حکومت کے خلاف ایک فتویٰ جاری کرنے پر غور کر رہے ہیں۔ البتہ امریکہ اپنے منصوبوں کو بدلنے میں تامل کا شکار تھا، اس بات کو اہمیت دیئیے بنا کہ جنگ کے آغاز میں آقائے سیستانی کے ہی ایک فتوے نے صدام کی شکست کو تیز تر کیا تھااور اگر آقائے سیستانی چاہتے تو امریکہ کی مشکلات میں اضافہ کر سکتے تھے مگر وہ جانتے تھے کہ کمزور عراقی حکومت امریکی مدد کے بغیر کام نہیں کر سکے گی۔ امریکی حملے پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے مقلدین کو قانون کی پاسداری، لڑائی اور لوٹ مار سے دوری اور جہادی تنظیموں میں شمولیت سے پرہیز کی نصیحت کی تھی۔ وہ ہمیشہ سماجی ضابطے میں رہ کر کام کرتے تھے۔ 8 مارچ 2004ء کو ٹرانزیشنل ایڈمنسٹریٹو لاء (عبوری انتظامی دستور) منظور ہوا جو نئی حکومت کے قیام تک موثر رہا اور مئی 2006ء میں بننے والے مستقل آئین نے اس کی جگہ لی۔ اسے صدام کی شکست کی پہلی برسی کے موقع پر عراقی اور امریکی قیادت کی طرف سے ایک بڑی کامیابی گردانا گیا۔ یہ ایک مثالی دستاویز تھی کہ جس میں کلی نکات بیان کئے گئے تھے جو لکھنے والوں کے خیال میں مستقل آئین کے رہنما اصول بنیں گے۔ اس میں جدید ریاست کے بہت سے عناصر ترکیبی تھے،

جیسے: حقوق کا بیان، فوج پر عوامی بالادستی، احتساب کا نظام، وغیرہ۔ اس میں انسانی حقوق کے تحفظ اور جمہوریت کے احترام کی شقیں شامل کی گئی تھیں۔ اس میں ریاست کی مختلف شاخوں میں اختیارات کی تقسیم اور قانون کی حکومت کی تعریف بیان کی گئی تھی۔ اس میں مفاہمت کا پہلو بھی تھا: عربی کے علاوہ کردی زبان کو بھی رسمی زبان قرار دیا گیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ کرد قومیت کو بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ کرد جمہوری پارٹی کے سربراہ مسعود بارزانی نے کہا کہ آئین نے کردوں کو برابر کا شہری ہونے کا احساس دلایا ہے، نہ دوسرے درجے کے شہری ہونے کا، اور اپنے لوگوں کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کردی زبان میں تقریر چھوڑ کر عربی بولنے لگے۔ [۱]

اگرچہ آقائے سیستانی عبوری حکومت کو ناجائز کہنے پر مصر تھے لیکن انہوں نے اپنی توجہ عبوری انتظامی دستور کی تفصیلات کی جانب مبذول کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے خدشات کی جزئیات بیان کرنے لگے۔ ایک خدشہ یہ تھا کہ "گروہی مفادات کی مداخلت" آئینی عمل کی مقبولیت کو کم کر دے گی۔ [۲]

مثال کے طور پر عبوری انتظامی دستور میں صدارتی شوریٰ بنائی گئی جو تین

---

[۱]۔ Dexter Filkins, "Iraq Council, with Reluctant Shiites, Signs Charter," New York Times, March 4, 2004.

[۲]۔ (بل ان من المؤكد ان المصالح الشخصية والفئوية و العرقية والحسابات الحزبية والطائفية ستتدخل بصورة او باخرى فى عملية الاختيار، و يكون المجلس المشكّل فاقداً للشرعيه [النصوص الصادرہ، صفحہ 76])۔

Sistani response to Associated Press questions, October 16, 2003.

ارکان؛ ایک کرد، ایک سنی عرب اور ایک شیعہ عرب؛ پر مشتمل ہو گی۔ یہ نسلی اور مذہبی اختلاف کو نمایاں کرنے والا ڈھانچہ تھا جو عراق کو فرقہ پرست حکمرانی کی دلدل میں پھنسانے کے لئے کافی تھا۔ آقائے سیستانی نے تنبیہ کی کہ نسلی اور مذہبی گروہ بندی سے چپک جانے سے شوریٰ فیصلے کرنے کے قابل نہ رہے گی اور "ملک کے اتحاد" کو نقصان پہنچے گا۔ [1]

آقائے سیستانی نے اقوام متحدہ سے رجوع کیا اور اس فرقہ وارانہ تقسیمِ اقتدار کے خلاف احتجاج کیا جسے انہوں نے تمام عراقیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والا عمل قرار دیا۔ انہوں نے لاٗ خضر براہیمی کے نام خط لکھا جس میں ایک ایک کر کے اپنی شکایات بیان کیں۔ اس بار ان کا لہجہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ انہوں نے کہا کہ عبوری انتظامی دستور پر بہت سی "قیود" عائد کی گئی ہیں اور شقوں کو اس پر "تھونپا" گیا ہے جو "بہت خطرناک" طرزِ عمل ہے کہ جس کا ازالہ کرنا ہو گا۔ صدر کے عہدے پر (تین افراد کی) شوریٰ کو بٹھانا عوام کی خواہشات کے مطابق نہیں ہے جیسا کہ "رائے عامہ کے بارے کی گئی اندازہ گیری اور دستخطی مہم میں لاکھوں افراد کی شرکت" سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن میں یا تو عبوری دستور کو مسترد کیا گیا ہے یا اس میں تبدیلیوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ بات کہ "جب تک تینوں ارکان میں اتفاق نہ ہو"، جو کہ اختلاف رائے کی صورت میں بعید تھا، صدارتی شوریٰ کو کوئی قدم اٹھانے کے لائق نہ چھوڑے گی۔ تعطل کا لازمہ بیرونی

---

[1] ۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 110۔

Sistani statement on the TAL, March 7, 2004.

قوت، جیسے امریکہ، کی مداخلت ہوگا۔ آقائے سیستانی نے خبردار کیا کہ نسلی اور مذہبی تفریق پر مبنی نظام مستقبل میں عراق کے "عدم استحکام، تقسیم اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے" کا سبب بنے گا[۱]۔ تاہم انہوں نے عبوری انتظامی دستور کے خلاف کوئی فتویٰ نہیں دیا۔ بظاہر اس وقت وہ مذاکرات کے ذریعے اپنا ہدف حاصل کرنا چاہتے تھے۔

آقائے سیستانی نے بریمر کی اس بات میں خاص طور پر مخالفت کی کہ عراق میں آزاد اور شفاف انتخابات کے لئے 30 جون 2004ء کی ڈیڈ لائن تک مناسب حالات پیدا نہیں ہو سکتے۔ آقائے سیستانی نے اس کے برعکس کے حق میں دلائل اکٹھے کئے۔ مثال کے طور پر صدارتی شوریٰ کی تجویز کے خلاف اندازہ گیری کا عمل اور عراقی معاشرے میں گردش کرنے والی عرضداشتیں عراقی عوام کے سیاسی بلوغ کا اظہار تھیں۔ یوں آقائے سیستانی نے ثابت کیا کہ وہ ملکی سیاست کے رجحانات سے باخبر تھے۔ انہوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ عالمی برادری کو عبوری انتظامی دستور کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے اور کہا کہ یہ بات اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل تک بھی پہنچائی جائے۔[۲]

اقوام متحدہ میں قرارداد نمبر 1546 کی منظوری سے قبل جون میں ایک اور خط لکھ کر انہوں نے جہاں جنوری 2005ء تک قومی انتخابات اور خودمختاری کی واپسی کے

---

[۱]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 111 تا 113۔

Sistani letter of response to Lahkdar Brahimi, March 18, 2004.

[۲]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 111 تا 113۔

_Ibid.

احتمال کو خوش آئند قرار دیا وہیں بڑے واضح الفاظ میں عبوری انتظامی دستور کا ذکر قرارداد میں شامل نہ کئے جانے کا مطالبہ کیا، کیوں کہ یہ ایک عارضی دستاویز تھی جو "غیر ملکی قبضے کے دوران لکھی گئی" تھی اور" (بین الاقوامی) قانون کے خلاف" تھی اور "عوام کی اکثریت کی طرف سے مسترد شدہ" تھی [1]۔فی الواقع قرارداد نمبر 1546 میں عبوری انتظامی دستور کا کوئی ذکر نہ کیا گیا۔

بنیادی طور پر آقائے سیستانی نے عبوری انتظامی دستور کو وقتی طور پر اس لئے مشروع سمجھا تاکہ مملکت کی وحدت کو قائم رکھا جاسکے اور عام انتخابات کی تاریخ طے کرنے اور حتمی آئین کی تیاری جیسے اہداف کی طرف سفر جاری رکھا جاسکے۔تاہم ابھی کچھ مسائل موجود تھے۔ اس عارضی دستور میں وفاقی طرز کا ڈھانچہ پیش کیا گیا تھا: دراصل یہ عراق کو ایک وفاقی ریاست قرار دیتا تھا جس میں قابل ذکر اختیارات صوبوں کو منتقل کئے گئے تھے۔دوسروں کی مخالفت کے باوجود کرد نمائندے عارضی دستور میں یہ شق شامل کرنے میں کامیاب رہے تھے کہ کوئی سے تین صوبے دو تہائی اکثریت سے اگر کسی قانون کی مخالفت کریں تو وہ حتمی آئین کا حصہ نہیں بنے گا۔چونکہ عراق کے تین صوبوں؛ سلیمانیہ، اربیل اور دہوک؛ میں کرد آبادی کی اکثریت ہے،

[1]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 112۔

Sistani message to the International Security Council: "A Warning to Refrain from Referring to the Law of Administration for the State in Security Council Resolution 1546," March 18, 2004.

لہذا اس شق نے عملاً کردوں کو حتمی آئین پر ویٹو کی طاقت دے دی، جو قومی انتخابات کے بعد لکھا جانا تھا۔ انہیں اس وقت تک پیشمرگہ (لفظی مطلب: وہ جو موت کے سامنے آتے ہیں) نامی لشکر رکھنے کی بھی اجازت دی گئی جب تک اس کی حیثیت کا تعین نہیں ہو جاتا۔ دوسرے لشکروں، جیسے شیعہ ملیشیاؤں، کی حیثیت کے بارے میں عبوری دستور میں کچھ نہ تھا۔ آقائے سیستانی سبھی لشکروں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے، اور صرف ریاستی عسکری اداروں کو ہی جائز سمجھتے تھے [۱]۔ عبوری دستور میں یہ شق بھی شامل تھی کہ 2005ء کے آغاز میں انتخابات سے پہلے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکے گی۔ [۲]

آقائے سیستانی نے اس معاملے پر ملی نکتہ نظر سے بات کی، جو باقی مسائل پر ان کے موقف سے ہم آہنگ تھی۔ وہ طاقت کی تقسیم اور اس سے مملکت کی وحدت کو لاحق خطرات پر پریشان تھے۔ آقائے سیستانی کی نظر میں "کردوں" اور "سنیوں" کو آئینی طور پر غیر بنانے سے بھی بڑا خطرہ ملی شیرازہ بکھرنے اور وطن کی تقسیم کا تھا۔ یہ منہج ان کے عراق محور طرزِ فکر کے ساتھ ہم آہنگ تھی جو وہ 2003ء سے اپنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ضبطِ نفس کا شاندار مظاہرہ کیا، اگرچہ کردوں نے نئے سیاسی

---

[۱]۔ (لسنا مع تشكل مثل هذه الميليشيات، و تأكيدنا على دعم القوة الوطنية العراقية [النصوص الصادرة، صفحہ 71])۔

[۲]۔ Andrew Arato, Constitution Making Under Occupation: The Politics of Imposed Revolution in Iraq (New York: Columbia University Press, 2009), 176–79.

بندوبست میں اپنے حق سے زیادہ طاقت حاصل کرلی تھی۔وہ وفاق سے متعلق سوالات پر یا تو غیر جانبدار رہے یا جواب دینے سے پرہیز کیا۔ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا: "وفاقیت کی اساس اور اس کی موزوں اقسام پر عراقی عوام کی رائے سے فیصلہ ہوگا" اور "اس وقت تک کسی تشہیر سے اجتناب برتا جائے گا۔" وہ اس عمل پر اثر انداز ہونے سے گریز کررہے تھے۔انہوں نے قارئین کو یقین دہانی کرائی کہ جن ماہرین کو کام سونپا جائے گا وہ "عراق کی وطنی وحدت اور اس کی سب قومی اکائیوں اور نسلی گروہوں کے حقوق کے تحفظ کا بہترین قاعدہ" ڈھونڈ نکالیں گے۔ [1]

انہوں نے فرقہ واریت کی مخالفت اور ملی وحدت کو ہر ممکن وسعت کے ساتھ بیان کر دیا۔اسی طرح جمہوریت کے بارے میں ان کی گفتگو ہمیشہ سب کو شامل کرنے والی ہوتی تھی اور انہوں نے کبھی کسی گروہ کو براہ راست اپنا مخاطب قرار نہ دیا۔جب ان پر شیعہ اکثریت کے بارے میں تبصرہ کرنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا، جو واضح عددی اکثریت کے بل بوتے پر حاکم گروہ بن سکتے تھے، آقائے سیستانی نے سب شیعوں کو ایک جیسا اور باقیوں سے الگ گروہ سمجھنے کی مخالفت کی۔انہوں نے کسی امتیاز کے بغیر (شہری کی حیثیت میں) شیعوں کو باقی عراقیوں کے برابر قرار دیا۔انہوں نے واضح کیا کہ شیعوں کی ضروریات "باقی عراقی شہریوں جیسی" تھیں جن میں "کسی فرقہ وارانہ امتیاز

---

[1] ۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 100 تا 103۔

Sistani response to Der Spiegel questions, February 15, 2004.

کے بغیر حقوق کا پورا ہونا" شامل تھا۔ [۱]

انہوں نے کسی قسم کی عسکری تنظیم بنانے کی مخالفت کی، چاہے اس کا مقصد مقدس شہروں کی حفاظت ہی کیوں نہ ہو۔ انہوں نے درجنوں فتوے تمام عسکریت پسند گروہوں کے غیر شرعی ہونے پر جاری کئے۔ [۲]

جہاں تک طرزِ حکمرانی کی بات تھی، انہوں نے کہا کہ اس کا فیصلہ سب کو مل کر، سیاسی وابستگی سے بالاتر ہو کر اور ملی استقلال کو مدنظر رکھ کر، کرنا ہوگا۔ یہی پلاٹنر صاحب کے نظریۂ جمہوریت کی روح ہے۔

آقائے سیستانی کوئی تجربہ کار سیاست دان نہ تھے لیکن وہ ایک سیاسی حس رکھتے تھے جس سے وہ ریاست کی بنیاد بننے والی دستاویز اور اداروں کے گہرے مضمرات کو

---

[۱]۔ (امّا ما يريده الشيعة فهو لايختلف عمايريده سائر الشعب العراقی[النصوص الصادرہ، صفحہ 45])۔

Sistani response to Asahi, July 19, 2003. Similar questions and answers were repeated over a two-year period regarding this process.

[۲]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 51۔

Sistani response to New York Times questions, July 28, 2003. This is one of many examples of Sistani's resistance to the formation of militias, even when he was asked about the formation of "special armies for the protection of the hawza or to monitor and maintain 'public ethics."

سمجھ سکتے تھے۔اے جی سی اور عبوری انتظامی دستور کی ساختاری فرقہ واریت نے ملکی سطح پر بھی اور خطے میں بھی اثرات مرتب کرنے تھے۔یہ 2004ء کے ابتدائی ایام تھے جب عبوری انتظامی دستور نافذ ہوا، اور اس وقت وطن کی سلامتی کو خانہ جنگی یا دہشتگردی کے خطرات لاحق ہونے کی بات کوئی نہیں کر رہا تھا لیکن آقائے سیستانی فرقہ وارانہ بنیادوں پر ریاست کی تشکیل میں چھپے خطرات کی پیش بینی کرنے میں کامیاب رہے۔البتہ وہ اس میں تنہا نہ تھے: خطے کے ماہرین نے لبنانی طرز کی تقسیم اقتدار کی خامیوں اور اس کے عراق کے لئے خطرناک ہونے کے بارے میں پہلے سے مقالے لکھ رکھے تھے۔بطورِ کلی تقسیم کی بابت آقائے سیستانی کے انتباہات کا رخ کردوں کی جانب نہیں بلکہ ریاست کی سالمیت اور آئینی عمل کی مقبولیت کی طرف تھا۔درحقیقت ان کے بیانات کا بیشتر حصہ فرقہ وارانہ جنگ کے خطرات کے بارے میں ہوتا تھا جو آگے چل کر عراقی ریاست کو لاحق ہونے والے تھے۔شیعہ سنی تقسیم کے بارے میں ان کے خیالات کی بنیاد یہ تھی کہ:

> "اگر بیرونی ہاتھ عراق کے معاملات میں دخل نہ دے تو عوام آپس میں بہتر طریقے سے ہم آہنگ اور یکسو ہو جائیں گے۔ [1]

آقائے سیستانی نے ریاست کا شیرازہ بکھرنے کے بارے میں پہلے سے انتباہ کر دیا

[1]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 65۔

Sistani response to Le Nouvel Observateur questions, August 29, 2003.

تھا کیوں کہ وہ عبوری ڈھانچے اور عملی تشدد میں موجود تعلق کو سمجھ رہے تھے، اس لئے نہیں کہ وہ کسی خاص نسلی گروہ کے مخالف تھے۔ ان کا پیغام کسی کے خلاف نہ تھا: وہ گروہ جنہیں سیاسی عمل میں حصہ نہ دیا گیا وہ تشدد کا راستہ اختیار کر رہے تھے۔ یہ نسخہ سانحے کو ہی جنم دے سکتا تھا۔

انتخابات اور ایک نیا آئین

30 جنوری 2005ء کو انتخابات کی تاریخ قرار دیئے جانے کے بعد آقائے سیستانی نے دوبارہ اپنی توجہ سیاست پر مرکوز کی۔ بہت کچھ داؤ پر لگ چکا تھا۔ دو سو پچھتر رکنی پارلیمان نے دائمی آئین تدوین کرنا تھا اور 15 اکتوبر 2005ء میں ریفرنڈم کے ذریعے نئے آئین کی توثیق تک عبوری حکومت بنا کر سب آئینی ذمہ داریاں پوری کرنی تھیں۔ اس کے بعد دسمبر 2005ء میں مستقل آئین کے تحت پہلی پارلیمان بنائے جانے کے لئے دوبارہ انتخابات ہونے تھے۔ 10 اکتوبر 2004ء کو آقائے سیستانی سے ان کے مقلدین نے سوال کیا کہ انتخابات کے معاملے میں ان کی ذمہ داری کیا ہے؟ انہوں نے جوابی فتوے میں بتایا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ انہوں نے تمام مرد و خواتین شہریوں سے کہا کہ وہ ووٹر لسٹ میں اپنے نام کے اندراج کی تصدیق کریں، اور اس کام میں ایک دوسرے کی مدد کے لئے انجمن سازی کی تلقین کی اور کہا کہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ "ہر عراقی شرکت کرے"۔ [1]

---

[1]۔ (بمشارکۃ جمیع العراقیین[النصوص الصادرہ، صفحہ 131])۔

Sistani referendum on registering the names in the voter records, October 10, 2004.

عراقی سماج پر تحقیق کرنے والے ایک ماہر کے مطابق یہ "عوامی جمہوریت کے لئے علمائے دین کے اعلیٰ ترین عزم کا اظہار تھا جس کی عراق کی حالیہ تاریخ میں مثال نہیں ملتی" [1]۔ اس ُووٹ د ؤفتوے میں صرف مقلدین کے بجائے سب عراقیوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ آقائے سیستانی نے ووٹ دینے کو شرعی ذمہ داری قرار دیا۔ ان کی دلیل یہ ہو سکتی ہے کہ اس سے تمام عراقیوں کو ایک ایسی ریاست بنانے کے لئے مل کر چلنے کا موقع ملے گا جس میں سب برابر ہوں، جس کے لئے وہ ایک سال سے انتھک کوشش کر رہے تھے۔ اس مرتبہ انہوں نے، ماضی کے برعکس، بار بار فتویٰ جاری نہ کیا۔ سیاسی عمل کی جزئیات میں مداخلت سے پرہیز کے عزم پر ثابت قدم رہتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ وہ راستہ ہموار کریں گے مگر سفر پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔ اس طرح اکتوبر میں دیا گیا فتویٰ سب عراقیوں سے انتخابات میں شرکت کی درخواست تھی۔ جب جنوری 2005ء کے انتخابات نزدیک آ گئے تو یہ امید کی جا رہی تھی کہ آقائے سیستانی ایک اور بیان جاری کریں گے یا کم از کم شیعہ تنظیموں کے اتحاد، ائتلا ف العراقی الموحد، کی حمایت کریں گے [2]۔ وہ اپنا وزن ان کے پلڑے میں ڈال کر بادشاہ گر بن سکتے

[1]۔ Reidar Visser, "Sistani, the United States and Politics in Iraq: From Quietism to Machiavellianism?" (Working Paper 700, Norwegian Institute of International Affairs, March 2006), 13.

[2]۔ The UIA won 140 of the 275 seats in the National Assembly of Iraq, with 48 percent of the vote. A majority required 138 seats.

تھے۔لیکن اگر انہوں نے اس اتحاد کی حمایت کا اعلان کیا ہوتا یا جنوری کے انتخابات کی بابت فتویٰ یا فتوے دیئے ہوتے تو مبصرین اور مقامی سیاست دانوں نے ان کو شک کی نگاہ سے دیکھنا تھا، انہیں فرقہ پرست سمجھنا تھا۔ذرائع ابلاغ نے ایسی خبریں چلائیں جن میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ آقائے سیستانی نے ائتلا ف کی حمایت کی ہے۔لیکن ان کے اس دعوے کی تصدیق کے لئے کوئی ثبوت موجود نہیں۔ [1]

یہ سوال کہ آیا آقائے سیستانی ائتلا ف کی حمایت کرتے ہیں یا نہیں، صحافیوں

---

[1]۔ Sistani had also issued statements around this time that warned his associates not to interfere in the elections. Additional evidence suggests that he did not offer his support because of the high volume of reporting that he was participating in events that had actually not taken place. He reiterated that no opinions attributed to him should be followed except those that were issued, signed, and stamped by his office in Najaf. Sistani had issued messages like these in the past in which he corrected information that the media had attributed to him. He reminded his followers that without his stamp of approval, the information circulated was likely fraudulent. Sistani often needed to issue statements of this nature because politicians and media outlets tried to feed off of his political prominence or wrongfully attributed statements to him.

اور تجزیہ نگاروں کے لئے ایک اہم موضوعِ بحث تھا۔ بہت سے محققین اس بات پر متفق تھے کہ انہوں نے ائتلا ف کی حمایت کی ہے، بلکہ فتوے کو ایک اور انداز میں سمجھا جائے تو ان کے لئے "دعا" کی ہے۔ تاہم اگلی سطر میں انہوں نے کہا کہ وہ انتخابات میں حصہ لینے والی سب سیاسی جماعتوں کی "تائید" کرتے ہیں۔ جب ان سے وضاحت طلب کی گئی تو انہوں نے کہا کہ جماعتوں کو ان کا نام یا نفوذ اپنے مفاد کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم ان کے کئی نمائندوں اور شاگردوں نے ائتلا ف کی حمایت کی، جس سے محققین نے یہ تاثر لیا کہ 2005ء میں آقائے سیستانی اس کی حمایت کرنے جا رہے ہیں۔ 16 دسمبر 2004ء کو آقائے سیستانی نے اس معاملے پر ایک سوال کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ وہ اس اتحاد کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں، لیکن وہ انتخابات میں حصہ لینے والی سب جماعتوں کی حمایت کرتے ہیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ انہوں نے باقی جماعتوں پر فوقیت دیتے ہوئے کسی ایک سیاسی جماعت کے حق میں کوئی فتویٰ جاری نہیں کیا اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ کچھ لوگ ووٹ حاصل کرنے کے لئے ان کا نام استعمال کر رہے تھے۔ [1]

انتخابات کے فوراً بعد آقائے سیستانی کے نمائندے حامد الخفاف نے ان کا بیان جاری کیا جس میں آئین اور سیاسی عمل کے بارے میں افواہوں کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ انہوں نے نہ تو کوئی نیا بیان جاری کیا ہے نہ ہی ان کی "سابقہ آراء"

[1]۔ Sistani's detailed explanation can be found at www.sistani.org/arabic/in-news/887.

یں حالیہ دنوں میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔انہوں نے مستقل آئین اور عراقیوں کی قومی شناخت کے تحفظ کے بارے میں اپنے سابقہ موقف کو باقی رکھا۔وہ قومی اکٹھ میں عوامی نمائندوں کے ترتیب کردہ بنیادی نکات کے حامی رہے۔ائتلاف نے اپنی انتخابی مہم کے دوران آقائے سیستانی کی بڑی بڑی تصاویر سب شہروں میں، یہاں تک کہ پولنگ سٹیشنوں پر بھی، آویزاں کی تھیں۔آقائے سیستانی نے کہا کہ "جو لوگ ان سے محبت کرتے ہیں وہ ایسا کام نہ کریں"۔[1]

ان کے ردعمل کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو سیاسی عمل سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ خطے کے تمامیت خواہ (totalitarian) آمر ہمیشہ اپنی بڑی بڑی تصویریں شہر بھر میں آویزاں کرواتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو ظل الٰہی اور طلسماتی شخصیت کے طور پر منوائیں۔ یہ انداز آقائے سیستانی کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔انہوں نے ہمیشہ سیاست پر اثر انداز ہونے اور اس میں عملی حصہ لینے کے بیچ موجود حد کا خیال رکھا۔اب کچھ نہ کرنے کا وقت تھا۔

جنوری کے انتخابات جوں جوں قریب آنے لگے، ایسے وقت میں جب عراقی عوام کو پر جوش ہونا چاہیے تھا، تشویشناک انداز میں دہشتگردی میں اضافہ ہونے لگا اور اس نے فرقہ وارانہ رنگ پکڑ لیا۔ائتلاف اور کرد جماعتوں نے انتخابات میں واضح

---

[1]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 141۔

Sistani delivered a statement, "A Referendum on Posting His Eminence's Pictures," in response to questions from his followers, April 16, 2005.

برتری حاصل کرلی لیکن سنی عربوں نے انتخابات میں کم حصہ لیا۔وہ آبادی کا تقریباً20 تھے لیکن صرف دو فیصد ووٹ دیئے گئے۔سنی عرب علاقوں میں تشدد عام تھا اور اس کی وجہ سے بہت سے سنی گروہوں، جیسے ہیئۃ علماء المسلمین ،نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ [1]

اہلسنت عربوں کی کم شرکت نے سارے عمل کی مقبولیت کو خطرے میں ڈال دیا جس نے انتخابات جیتنے والوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ سنی عربوں کو مستقبل میں آئین لکھنے کے عمل میں شریک ہونے پر راضی کریں۔(سنی علاقوں میں کم ووٹ کاسٹ ہونے کی وجہ سے) 275 کامیاب امیدواروں میں صرف 17 سنی عرب تھے۔چھ ماہ بعد، جون 2005ء میں، آقائے سیستانی نے انتخابی عمل میں ایسی تبدیلیاں کرنے پر زور دیا جو آئندہ بننے والی اسمبلیوں میں سنی عربوں کی کما حقہم نمائندگی کو یقینی بنا سکیں۔آقائے سیستانی نے تجاویز بھی مرتب کیں جو جنوری کے انتخابات میں اپنائے گئے نظام کا متبادل ہوسکتی ہوں۔اس طرح قومی انتخابات میں ووٹر ملک گیر فہرستوں کے بجائے صوبائی سطح پر بننے والی فہرستوں میں سے اپنے نمائندگان چن سکیں گے۔نئی صوبہ محور تجویز ماننے سے نشستوں کی تعداد کو آبادی کے تناسب سے ہم آہنگ کرنا ممکن ہوگا۔اس طرح ووٹ ڈالے جانے کی شرح کا اثر نہیں ہوگا۔آقائے سیستانی نے واضح کیا کہ اس نئے انتخابی نظام کی اہمیت یہ ہے کہ یہ عراق کی نازک سیاسی صورتحال کی عکاسی کرتا ہے۔وہ اس لئے یہ اقدام اٹھا رہے تھے کہ

[1]۔ عرضِ مترجم:۔عرب عراقیوں میں اہلسنت اقلیت میں ہیں لیکن پچھلے اسی سال سے عراق میں آمروں کی حکومتوں نے ان کو خصوصی مراعات دے کر شیعہ عرب اور سنی کرد شہریوں کو محروم رکھا تھا تاکہ عوام کو تقسیم کرکے آسانی سے حکومت کی جاسکے۔اب صدام کے اقتدار سے الگ کئے جانے اور جمہوریت کے آنے کو سنی عربوں کی مراعات کیلئے خطرہ بنا کر پیش کیا جارہا تھا۔

ماضی میں "بہت سی غلطیاں ہوئیں۔" ہمیشہ کی طرح آقائے سیستانی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ "سب شہریوں کو" جمہوریت میں حصہ لینا چاہیے۔ [1]

مئی میں نئی حکومت کے آغاز کے بعد آئین لکھنے والوں میں باقی ماندہ اختلافی نکات پر بحث شروع ہوئی۔ سب سے زیادہ جس نکتے پر بحث ہوئی وہ وفاقیت اور عراق کی متعدد علاقوں میں تقسیم کا خطرہ تھا۔ وفاقی طرز حکومت کے بارے میں مسودہ کردوں نے تیار کیا تھا اور مرحوم آقائے باقر الحکیم کی جماعت المجلس الاعلیٰ الاسلامی العراقی، نے اس کی حمایت کی تھی۔ آقائے سیستانی نے ان بحثوں میں دخل نہ دیا اور مختلف گروہوں کو مذاکرات کرنے دئیے۔ وہ اس لئے خاموش نہ تھے کہ یہ بحث اہمیت نہ رکھتی تھی، بلکہ اس لئے کہ گروہوں کو اپنا اختلاف خود حل کرنا تھا۔ جیسا کہ وہ امریکہ یا عراقی گورننگ کونسل کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے، اسی طرح وہ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں بھی مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ جمہوری طور پر منتخب شدہ سیاسی جماعتوں کے سیاسی نظام کے ساتھ تعامل میں ان جماعتوں کے ارتقاء کا احتمال کافی زیادہ تھا۔ جیسا کہ آگے چل کر ہوا، آقائے سیستانی کی پیش بینی کے مطابق مستقل آئین کے نکات پر علاقائی اور نسلی بنیادوں پر مفاہمت پیدا ہوئی۔ سب گروہوں کے حقوق کے تحفظ کا خیال عبوری انتظامی دستور میں بھی رکھا گیا تھا، اس دستاویز کو مشہور ماہر قانون اینڈریو آراتو نے "موزوں پیرہن" سے تعبیر کیا تھا جس

---

[1] See, for example, Sabrina Tavernise, "Aiming to Reduce Violence, Shiite Hints at Wider Voting Role for Sunnis," New York Times, June 28, 2005.

کے آگے چل کر اچھے سیاسی اثرات مرتب ہوئے۔ [۱]

مستقل آئین میں وفاقی طرز پر کردوں کے علاقائی خودمختاری کے بہت سے مطالبے تسلیم کئے گئے، جنہیں "اقالیم" کی صورت میں بیان کیا گیا۔ کردوں نے عبوری انتظامی دستور میں دیئے گئے سب اختیارات کو دوبارہ حاصل کرلیا اور ان کے علاوہ بھی مرکز پر کچھ امتیازات حاصل کرلئے۔ آئین کی شق 117 نے کردوں کے تین صوبوں دہوک، اربیل اور سلیمانیہ کو قانونی طور پر علیحدہ علاقہ تسلیم کیا جو "حکومتِ اقلیمِ کردستان" کے ماتحت ہوں گے۔ اس حکومت کے پاس وفاقی قوانین کے اطلاق میں تبدیلی کرنے کا حق تھا، سوائے ان مخصوص شقوں کے جو وفاق کا خاصہ ہیں، اور اس کو اپنی حفاظت کے لئے ایک نیم فوجی لشکر رکھنے کی بھی اجازت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حکومت کے پاس بیرون ملک سفارت خانے کھولنے کا حق بھی تھا۔ آئین کی شق 4 میں عربی کے ساتھ ساتھ کردی زبان کو بھی قومی زبان تسلیم کیا گیا۔ جنوری 2005ء میں جب صوبائی انتخابات ہوئے تو کردستان کی قومی اسمبلی کے لئے بھی انتخابات برپا ہوئے، جو حکومتِ اقلیمِ کردستان کی الگ پارلیمنٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔ کردستان قومی اسمبلی نے 12 جنوری 2005ء کو مسعود بارزانی صاحب کو کردستان کا صدر منتخب کیا۔ [۲]

---

[۱]۔ Arato, Constitution Making, 198.

[۲]۔ For an analysis of Kurdish gains in Iraq's political process, see Kenneth Katzman, "The Kurds in Post-Saddam Iraq," Congressional Research Service, October 1, 2010, https://fas.org/sgp/crs/ mideast/ RS22079.pdf.

مولانا سید عبدالعزیز الحکیم، جو عراق کے جنوب میں خودمختاری کے حامی تھے، نے ایک دھماکہ دار بیان جاری کرتے ہوئے جنوب کے نو شیعہ اکثریت والے صوبوں کے لئے ایک اقلیم قائم کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ وہ ایک ایسی علاقائی اکائی کا تصور پیش کر رہے تھے جیسی کردوں کو شمال میں حاصل ہوئی تھی۔ یہ وزیر اعظم ابراہیم جعفری کی سوچ سے اختلاف تھا، جو مرکز کو زیادہ طاقتور دیکھنا چاہتے تھے اور ان نو صوبوں کو الگ الگ حیثیت دینا چاہتے تھے [۱]۔ ان صوبوں میں عراق کی آدھی آبادی اور اسی فیصد تیل پایا جاتا ہے [۲]۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ایک شیعہ شناخت کا علاقہ بن جائے گا اور ایسی اکائی بھی بن سکتا ہے جو مرکز پر بہت زیادہ اثر ڈال سکتا ہو۔ کردوں نے طاقت کے اس ارتکاز کو رد کرنا تھا اور سنی عربوں میں یہ احساس پیدا ہونا تھا کہ وہ درمیان میں کمزور اور بے بس رہ جائیں گے۔ ان کے لئے وفاقی طرز کی ریاست میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مولانا حکیم کا پیش کردہ تصور آقائے سیستانی کی خواہش سے انحراف تھا جو ریاست کے نزدیک تمام عراقیوں کی برابری کے قائل تھے۔ یہ بیان آقائے سیستانی کے عراق کی وحدت کے تصور سے بھی ٹکراتا تھا اور اس نے

---

[۱]۔ For a discussion of the context of Hakim's announcement, see Juan Cole, "Federalism Issue Bedevils Constitution," Informed Comment, August 11, 2015, https:// www.juancole.com/ 2005/ 08/ federalism-issue- bedevils- constitution.html.

[۲]۔ Arato, Constitution Making, 228.

دوبارہ عراق کی "سرد تقسیم" کی بحث کو زندہ کر دیا[1]۔ اہم بات یہ ہے کہ سید عبد العزیز الحکیم کا تصور شیعہ سوچ کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ شیعہ عوام کی اکثریت مضبوط مرکز دیکھنا

---

[1] Soft partition meant that Iraq should be fragmented into three regions rather than be governed by a central government. For a detailed explanation, see Edward P. Joseph and Michael E. O'Hanlan, "The Case for Soft Partition in Iraq" (Analysis Paper Number 12, The Saban Center for Middle East Policy at the Brookings Institution, June 2007), https://www.brookings.edu/research/the-case-for-soft-partition-in-iraq. Reidar Visser argued that SCIRI was not representative of the range of Shiite political parties and did not have wide appeal to the Iraqi electorate. SCIRI had a long history of operation in exile in Tehran and was susceptible to Iranian influence. The UIA was also composed of seventeen other parties with divergent viewpoints on a range of issues. Visser suggested that ignoring 75 percent of the UIA would empower "Iranian clerics in Iraq." Reidar Visser, A Responsible End? The United States and the Iraqi Transition, 2005–2010 (Charlottesville, VA: Just World Books: 2010), 47.

چاہتی تھی اور صرف کردوں کے لئے جزوی وفاقیت کی قائل تھی[1]۔سال بھر کے لئے بصرہ کے شیعوں میں قریبی علاقوں کی ایک اقلیم کے لئے کبھی کبھی تحریک اُٹھتی رہی لیکن اس چھوٹی اکائی کے حق میں بھی عوامی حمایت بہت کم رہی۔مقتدیٰ الصدر اور حزب الدعوۃ بھی مضبوط مرکز کے قائل تھے۔ 2007ء تک سید عبدالعزیز الحکیم کی جماعت مجلس اعلیٰ کا وفاقیت اور ایک بڑے شیعہ اقلیم کے بارے میں جوش بھی مدہم پڑ گیا۔اب مجلس اعلیٰ نے بھی ”عراقی عوام کی رائے“ کو اپنے بیانیے کا مرکز بنا لیا[2]۔واضح تھا کہ عوام کی اکثریت کے وفاقیت کو پسند نہ کرنے کی وجہ سے انہیں اپنا موقف بدلنا پڑا ہے۔

لیکن ”تجزیہ طلبی“ کی اصل بنیاد وفاقی طرز کے آئین میں استعمال ہونے والی زبان کی ساخت تھی جس کے بارے میں آقائے سیستانی ہمیشہ خبردار کرتے رہے تھے۔آئین کی شق 118 میں کہا گیا تھا کہ اگر صوبوں کی ایک سادہ اکثریت الگ اکائیاں بنانا چاہے تو انہیں اس کا حق ہوگا۔درحقیقت آئین کی شق 112 تا 117 کی تشریح نے مستقبل میں مختلف اکائیوں کی شکل میں ممکنہ تقسیم کی ضمانت دی تھی۔آنے والے چند سالوں میں عراقیوں میں اقالیم کی ساخت اور ان کے اختیارات، خصوصاً تیل اور

[1]۔ Iraq specialists understood the diverse voices within the UIA. For example, followers of Muqtada al-Sadr held a strong centralist position, as was true of the followers of Jaafari and then Maliki, the two Shiite prime ministers who assumed power in 2005 and 2006, respectively.

[2]۔ Visser, A Responsible End, 63.

سرحدوں پر تجارت کے معاملات، پر بحث ہوتی تھی۔ آقائے سیستانی نے جس طرح انتخابات میں جزئی بحثوں میں حصہ نہ لیا تھا اسی طرح وفاقیت کے سوال پر بھی جزئیات سے الگ رہے۔ درحقیقت جب آئین کا مسودہ تیار ہو گیا تو تمام تر مسائل کے باوجود آقائے سیستانی نے اس کی مخالفت نہ کی۔ انہوں نے عراق کے تمام شہریوں سے درخواست کی کہ وہ ریفرنڈم میں آئین کے حق میں ووٹ دیں "اگرچہ کچھ خامیاں دور نہیں ہوسکی ہیں"۔ [1]

15 اکتوبر 2005ء کو (ریفرنڈم کے ذریعے) آئین نافذ کر دیا گیا۔ اس وقت تک آقائے سیستانی کردوں اور مجلس اعلیٰ کی سیاسی نظام میں زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کی ضد سے تنگ آچکے تھے۔ ایک مقلد نے 15 دسمبر 2005ء میں 275 رکنی ارکان نمائندگان کے چناؤ کے لئے آنے والے انتخابات کے بارے میں سوال کیا۔ ان انتخابات میں نشتیں آبادی کے تناسب کے حساب سے تقسیم کی گئی تھیں تاکہ اہلسنت کی نمائندگی کو یقینی بنایا جاسکے۔ سنی عربوں نے جنوری 2005ء کے انتخابات میں نہایت کم ووٹ ڈالے تھے لیکن دسمبر کے انتخابات میں بہت سوں نے شرکت کی اگرچہ وفاقیت کی شقوں کے خلاف ان میں ناراضی پائی جاتی تھی۔ انہوں نے انتخابات کا بائیکاٹ اس معاہدے کی بنا پر نہیں کیا کہ پہلی پارلیمان کے ماتحت آئین پر نظرِ ثانی کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے گی جو ترامیم کی تجاویز تیار کرے گی جنہیں ایک واضح اور سادہ انداز میں اپنایا جاسکے۔ دسمبر میں سنی عربوں نے 275 میں سے 60 نشتیں جیت لیں۔

---

[1] ۔ Sistani fatwa, October 13, 2005.

آقائے سیستانی نے ایک مختصر فتویٰ دیا جس میں زور دیا کہ سب مرد اور خواتین ووٹ دیں اور انتخابات میں عوام کی "پرزور" شرکت کی امید ظاہر کی۔ انہوں نے ووٹرز کو یہ نصیحت بھی کی کہ اپنی ووٹ کو ضائع ہونے یا تقسیم ہونے سے بچائیں۔ [۱]

اس سیاسی رسہ کشی کے ماحول میں اس نصیحت کو ائتلاف العراقی الموحد کی ملفوف حمایت سمجھا گیا جو جنوری کی نسبت دسمبر میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب رہا[۲]۔ ائتلاف یوں بھی اکثریت کی نمائندگی کرتا تھا، چنانچہ اس کی جیت کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ تاہم اگرچہ اس اتحاد میں مضبوط مرکز کے حق میں کچھ بلند آوازیں موجود تھیں لیکن انہیں اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ائتلاف کی حکمت عملی عراق کی تمام آوازوں کی عکاسی نہیں کرتی تھی، بلکہ صرف حزبِ اقتدار کی نمائندگی کرتی تھی، وہ افراد جو امریکی حملے سے پہلے اور بعد میں امریکی انتظامیہ سے رابطے میں تھے۔ اس رابطے نے شیعہ موقف کے بارے میں امریکیوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ شیعہ عوام وفاقیت کے قائل ہیں۔ مئی 2006ء میں امریکی سینیٹر جو بائیڈن کی طرف سے عراق کی "سرد تقسیم" کا منصوبہ پیش کرنے پر اس رابطے کا بھی ایک اثر ہوسکتا ہے۔ بائیڈن کے منصوبے "ایک عراق اور تین اکائیاں" میں مسئلہ یہ تھا کہ عراق کا آئین وفاقیت کو عراق

---

[۱]۔ وعلی المواطنین - رجالاً ونساءاً - ان یشارکوا فیها مشارکة واسعة [النصوص الصادرہ، صفحہ 148]۔
Sistani statement on Iraqi elections, December 10, 2005.

[۲]۔ Bassem Mroue, "Iraq Closing Borders Ahead of Election," Agence France Presse, December 11, 2005, as quoted in Visser, "Sistani, the United States and Politics in Iraq," 19.

کی حکمرانی کے ایک کلی اصول کے طور پر قبول نہیں کرتا تھا۔ کردستان کے سوا کوئی اور وفاقی اکائی بنانا عوام کی منشاء پر چھوڑ دیا گیا تھا جسے ریفرینڈم کے ذریعے متعین کیا جانا تھا۔ بائیڈن صاحب کا بیان عراقی آئین کے خلاف تھا، جو غیر ملکیوں کو عراقی ریاست کے ڈھانچے پر اثر انداز ہونے کا حق نہیں دیتا، نئی وفاقی اکائیاں عراقی عوام نے "نچلی سطح پر" طے کرنی ہیں۔ [۱]

وفاقیت آقائے سیستانی کی نظر میں عراقی آئین کے ریاست کی تقسیم کا طریقۂ کار متعین کرنے تک محدود نہ تھی۔ عراق کے حصے بخرے ہونا اس طویل تاریخ نگاری کا تسلسل ہوتا کہ جس کے مطابق عراق میں مختلف لوگوں کو اکٹھا کر دیا گیا تھا، جو ایک واحد قومی شناخت نہیں رکھتے تھے۔ یہ وہ بیانیہ ہے جو عراقی ریاست کو مصنوعی بندوبست سمجھتا ہے اور آقائے سیستانی اس کو کھوکھلا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اگر حقیقت آقائے سیستانی کے بیانیے سے ہم آہنگ تھی اور عراقی اپنی قومی ریاست میں متحد تھے، تو آئین ایسی مقبول تحریکوں کو ایندھن فراہم نہیں کر سکتا تھا جو عراق کو مختلف اکائیوں بانٹ دیں۔ یہاں تک کہ اگر مرکزی حکومت مفسد اور غیر مقبول بھی ہوتی، ایسا مسئلہ جس کی طرف آقائے سیستانی نے نوری المالکی کی حکومت میں کئی مرتبہ توجہ کی، تو بھی وفاقی طرز کی ریاست کے مطالبے کو عوامی پذیرائی حاصل نہ ہوتی۔ سچ یہ ہے کہ زوال عراقیوں کی وطن

[۱]۔ The proposal was made in an op-ed: Joseph R. Biden Jr. and Leslie H. Gelb, "Unity Through Autonomy in Iraq," New York Times, May 1, 2006. See also Visser, A Responsible End, 250.

دوستی میں نہیں آیا، بلکہ حکومت کی اس سیاست کی حمایت میں کمی آئی جو آقائے سیستانی کی طرف سے کی جانے والی تاریخ کی تفسیر سے ہم آہنگ نہ تھی۔

البتہ آقائے سیستانی یہ سمجھتے تھے کہ خواص عوامی امنگوں کو نظرانداز کر کے سیاست کو اپنے مفاد کے مطابق بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ریاست کے ایسے ڈھانچے پر زور دیتے تھے جس میں عوام کا سیاسی عمل میں زیادہ سے زیادہ دخل ممکن ہو سکے۔ آقائے سیستانی کی نظر میں دائمی آئین میں خامیاں تھیں لیکن انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ عبوری انتظامی دستور میں سرکاری مناصب کو واضح نسلی اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے والی شقوں کو ہٹا دیا گیا تھا۔

مذہب، بالخصوص اسلام کا آئین اور ریاست میں مقام دوسرا اہم معاملہ تھا جس پر آئین کے متن پر ہونے والی بحث میں بہت اختلاف ہوا۔ تاہم آقائے سیستانی کی حکمت عملی اور ترجیحات میں اس بحث کو اولویت نہیں دی گئی۔ ان کے فتوے، بیانات اور اعلانات میں مذہبی کارڈ استعمال ہوتا نظر نہیں آیا۔ لیکن قدامت پسند تنظیمیں، جیسے مجلس الاعلیٰ وغیرہ، اس سلسلے میں آئین میں خاص زبان اور ذاتی زندگی کے قوانین میں فقہ کو نمایاں کرنا چاہتی تھیں۔ یہ لوگ نہ تو حوزہ علمیہ کی نمائندگی کرتے تھے نہ ہی فقہی معاملات میں مرجع تھے۔ کئی پہلوؤں سے آقائے سیستانی کا مذہبی کارڈ کھیلنے سے اجتناب کرنا چارلس ٹیلر کی رائے سے قریب ہے کہ جدید دور کے مسائل پر اسلام کی رائے ہر فرد کے نزدیک الگ ہے، اور جدت کے ساتھ یہ انفرادیت بڑھتی ہے۔ آقائے سیستانی کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ آئین کے مذہبی پہلوؤں پر ایسی رائے دیں جو سب شیعہ اہلِ نظر کی نمائندگی کا حق

ادا کر سکے، نہ ہی ان پر ایسا کرنے کی ذمہ داری تھی کیوں کہ وہ حوزہ علمیہ کے سر براہ تھے۔ تاہم ان کا عکس العمل مذہب سے بالکل لاتعلق اور مکمل سیکولر ریاست کے حق میں بھی نہیں تھا۔ ایسا کرنا ان کی اسلام کو معاشرے کی اخلاقی بنیاد کے طور پر باقی رکھنے کی ذمہ داری کے خلاف جاتا۔ اس آئینی بحث میں آقائے سیستانی کا مطمع نظر اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ اکثریت کی قومی شناخت جمہوری اصولوں سے ہم آہنگ اور محفوظ رہے۔

آئین میں اسلامی دفعات کے معاملے نے امریکی اور دوسرے مغربی صحافیوں اور پالیسی سازوں میں بہت ابہام پیدا کیا۔ شیعہ مراجع اور ان کے "شرعی قوانین پر مبنی آئین" کو لاگو کرنے کے عزائم کے بارے میں قیاس آرائیاں 2003ء سے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ جنوری 2005ء کے انتخابات کے بعد اس سوال پر کہ اسلام کے بارے میں نظریہ پردازی کی شکل کیا ہوگی، بعض اوقات قرائن کی طرف اشارہ کئے بغیر بھی بحث جاری رہی [1]۔ کچھ محققین نے کہا کہ "آقائے سیستانی اور دوسرے مراجع مذہبیت کو عراقی آئین کا حصہ بنانے پر سارا زور صرف کر دیں گے۔" یہ سمجھا جا رہا تھا کہ "وہ اگر ہر بات میں مداخلت نہیں کر رہے تو وہ مناسب موقع کی تلاش میں ہیں"۔ [2] تاہم یہ مباحث مستقل آئین کی تدوین سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں۔

---

[1]۔ See Alex Berenson, "Iraq's Shiites Insist on Democracy. Washington Cringes," New York Times, November 30, 2003.

[2]۔ Edward Wong, "Leading Shiite Clerics Pushing Islamic Constitution in Iraq," New York Times, February 6, 2005.

سب سے زیادہ تحفظات آئین کی دوسری دفعہ کے بارے میں تھے، جو یہ ہے:

اول: اسلام ریاست کا سرکاری مذہب ہے اور قانون کا بنیادی ماٗخذ ہے۔

(ا)۔ کوئی قانون جو اسلام کے مسلم اصولوں کے خلاف ہو، نہیں بن سکتا۔

(ب)۔ جمہوریت کے اصولوں کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکتا۔

(ج)۔ کوئی ایسا قانون جو اس آئین میں بیان کئے گئے بنیادی حقوق اور آزادیوں کے منافی ہو، نہیں بنایا جاسکتا۔

دوم: یہ آئین عراقی عوام کی اکثریت کے اسلامی تشخص کی ضمانت دیتا ہے اور سب شہریوں کے مذہبی حقوق کے تحفظ اور عقیدے وعمل کی آزادی یقینی بناتا ہے۔۔۔۔[1]

یہ زبان نہ صرف مبہم تھی، بلکہ بعض مبصرین کے لئے یہ تضادات پر مبنی تھی کیوں کہ یہ روزمرہ کی حکمرانی کے لئے کوئی رہنما اصول فراہم نہیں کرتی تھی نہ ہی عدالتوں کو مقدمات کے فیصلے میں کوئی مدد دیتی تھی۔ بہرحال اس کا مقصد ایسی کوئی واضح رہنمائی فراہم کرنا تھا ہی نہیں۔ باقی عرب ممالک کے دساتیر اور عراق کے سابقہ آئین کی مشابہ دفعات کی طرح ان دفعات نے اسلام کے ریاستی مذہب ہونے کا رسمی اعلان کیا، جو مذہب اور ثقافت کے احترام کا اظہار تھا۔ دوسرے عرب ممالک میں بھی ان باتوں

---

[1]۔ For the latest version of the Iraqi constitution, access the following: www.iraqinationality.gov.iq/ at tach/ iraqi_ constitution.pdf.

پر آئینی مباحث ہوئی تھیں کہ آیا اسلام قوانین کا ایک ماٴخذ ہے یا اسلام ہی قوانین کا واحد ماٴخذ ہے؟ مثال کے طور پر مصر میں 1972ء میں آئین کی دوسری شق میں "اسلامی فقہ کے اصول قانون سازی کا ایک ذریعہ ہیں" کی جگہ ترمیم کر کے یہ لکھا گیا کہ "اسلامی فقہ کے اصول قانون سازی کا اہم ترین ذریعہ ہیں"۔ جناب ناتھن براؤن، مشرق وسطیٰ کے دساتیر کے ماہر، نے احتمال ظاہر کیا تھا کہ یہ ترمیم حکومت کی طرف سے مذہبی کارڈ کو استعمال کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ اگرچہ یہ ترمیم اس وقت کی گئی جب مصر کا سپریم کورٹ (محكمة الدستورية العليا) اپنی آزاد حیثیت برقرار کر چکا تھا اور شریعت کی اپنی تشریح نافذ کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ البتہ براؤن کا کہنا ہے کہ سپریم کورٹ نے اس ترمیم کو مصر کے آئین کی حدود واضح کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ اس کے بعد آنے والے فیصلوں سے پتا چلا کہ فقہ کو ایک مستقل قانون کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ [1]

---

[1]۔ Article 2 of Egypt's 1971 Constitution recognized that "the principles of Islamic Sharia are a main source of legislation." The article was amended in 1981, following the May 22, 1980, referendum to "the principles of Islamic Sharia are the main source of legislation" (emphasis added). See Nathan J. Brown, Constitutions in a Nonconstitutional World: Arab Basic Laws and the Prospects for Accountable Government (New York: SUNY Press, 2002), 180–84.

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ):

Brown outlines the various Supreme Constitutional Court rulings and their interpretations of Article 2 over the years. It is also generally the case that some of these regime gestures to amend the constitution and increase their own Islamic credentials tended to follow legitimacy crises or major exogenous or endogenous shocks to their systems. In the case of Egypt, President Sadat had signed a peace deal with Israel in 1979 that was not well received by neighboring Arab countries. Egypt, formerly the headquarters of the Arab League, saw its membership suspended, until its reinstatement in 1989. Domestically, Sadat wanted to appeal to members of the Muslim Brotherhood, given their widespread popularity, in a bid to regain legitimacy following this unpopular deal. In discussions with Yusuf al-Qaradawi, formerly a leader and member of the organization, Qaradawi wondered whether the proposed changes to the constitution were an attempt to co-opt the voices of the Islamists. At that time, Sadat also offered Qaradawi a position in the ministry, which he declined, expressing an interest in retaining his autonomy. Sadat, in reaction to domestic and regional unrest, attempted to gain moral authority.....

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اگر یہ مثال اور علاقے کے دوسرے دساتیر کی ایسی مثالیں کوئی اشارہ دیتی ہیں تو یہ ہے کہ عراقی آئین کی پہلی اور دوسری دفعات میں استعمال ہونے والی زبان اپنی اصل میں کوئی تشویش ناک چیز نہیں ہے[1]۔ اسے سمجھنے کے لئے ہمیں عدالتوں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ):

and offer a symbolic gesture to Islam with his proposed amendment. The amendment to the constitution did not save him. He was assassinated by members of the Egyptian Islamic Jihad on October 6, 1981. As it turned out, the amendment would not have a great impact on legislation. Instead, broader policy issues, such as peace deals and US foreign policy, not the constitution, would shape the political behavior of Egyptians.

[1]۔ See Noah Feldman and Roman Martinez, "Constitutional Politics and Text in the New Iraq: An Experiment in Islamic Democracy," Fordham Law Review 75, no. 2 (2006): 902–05. The authors offer a detailed account of the changes from the TAL to the permanent constitution, caused by pressure from people whom they referred to as the "leading Shiʿi clerics," or negotiations that reflected the stronger hands of the "Shiʿi Islamist parties."

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے مجموعی کردار اور علاقے میں مذہب کی بنیاد پر سیاست کرنے والوں کو سمجھنا ہوگا، جو یہاں "شیعہ تنظیمیں" ہیں جیسے مجلس اعلیٰ کے کارکنان جنہوں نے آئین کا مسودہ تیار کرنے میں حصہ لیا۔ آئین کے کچھ نقاد چاہتے تھے کہ اس میں کوئی ابہام اور تضاد نہیں ہونا چاہیے اور کچھ صنفی تاثر والے جملوں، جیسے "ہم نے آدمؑ کے بیٹوں کو فضیلت دی" پر بھی اعتراض ہوا کہ اس میں بیٹوں کے ساتھ بیٹیاں کیوں نہیں ہیں۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ):

Despite some of the generalized language on Islamists used, Feldman and Martinez do an excellent job analyzing the enhancements in the constitutional language with changes in words such as "respect" for "guarantee" of rights. The authors also help to contextualize the debates about Islam as a "fundamental" source of legislation rather than just "a source of legislation." However, the broader problem I am addressing here is the care that is needed to undo the broader "Shiite bloc" terminology that we use to discuss these issues and the power and action attached to these groups. It's important to distinguish the "Islamism" of Sistani from those who, although they may have religious ideas, may not have the credentials to engage in jurisprudence. However, they do have political power and the space to legislate.

محقق شاک ہانیش نے لکھا کہ آئین کی وہ دفعات جن میں انسانی حقوق کے احترام جیسے اصولوں کا ذکر ہے نا قابل عمل ہوں گی اگر انہیں فقہ کے تابع رہنے والی شق کا پابند بنایا جائے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ مسلمانوں کی سب مذہبی تبلیغ، حقوق اور مساوات کے جدید تصورات کے برعکس ہے۔ ان کے تجزئیے کے مطابق یہ دستاویز قدیم فقہ کی تائید کرنے کی وجہ سے "قدامت پسندانہ اورحتیٰ ردعمل کی نفسیات کا عکس" تھی۔ ہانیش صاحب کے خیال میں تاریخ میں اسلامی حکومتوں کے طرزعمل کی روشنی میں یہ ابہام "حریت اور جمہوریت کے تصور کی جدید تشریح کی مخالفت" کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ ہانیش صاحب کا تجزیہ آئین کی سطر بہ سطر نقد پر مشتمل تھا تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ آئینی دفعات مبہم اور متضاد ہیں۔ انہوں نے یہ بھی ثابت کرنا چاہا کہ آئین کلی طور پر انسانی حقوق اور معاشرے میں خواتین کے کردار کے معاملے میں عقب ماندگی کی طرف ایک قدم تھا۔ ان کے مطابق اس کا سبب وہ رکاوٹیں اور پابندیاں تھیں جو اسلام کے نام پر قوانین کی تشریح پر لگادی گئی تھیں۔ لیکن ہانیش صاحب اور کچھ دوسرے دانشوروں کا تجزیہ مذہبی لوگوں کی شمولیت کے اہداف کے بارے میں قیاس آرائیوں اور طاقت حاصل کرنے کے بعد ان کے رویّے میں تبدیلی آجانے کی پیش بینی جیسے اوہام پر کھڑا ہے۔ [۱]

---

[۱]۔ Shak Hanish, "The Role of Islam in the Making of the New Iraqi Constitution," Digest of Middle East Studies 16, no. 1 (2007): 30–41.

دستاویز کو مبہم کے بجائے لچکدار کہنا زیادہ مفید ہے، جیسا کہ محقق حیدر حمودی صاحب نے کہا ہے۔ان کے مطابق متن کی زبان جان بوجھ کر انتخاب کی گئی تھی تا کہ آئین میں ارتقاء اور وقت کے مطابق بہتری آنے کی گنجائش رکھی جا سکے۔آئین کو لچکدار ہونا چاہیے تا کہ وہ سیاسی رجحانات سے بالاتر ہو اور جوں جوں ریاست کے قدم جمتے جائیں، اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو[1]۔حیدر حمودی صاحب کے مطابق آئین کی کچھ تشریحات میں غلطی وہاں پر ہے جہاں ”آئینی اور دستوری تبدیلی کا جامد اور رسمی تصور“ اپنایا گیا، جس کے مطابق آئین میں تبدیلی صرف تحریری ترمیم کے ذریعے آتی ہے۔ حمودی صاحب نے امریکی آئین کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ قانون دانوں نے آئین

---

[1]۔ See Haider Hamoudi, "Notes in Defense of the Iraqi Constitution," University of Pennsylvania Journal of Law and Social Change 14, no. 4 (2011): 395–97. Hamoudi acknowledged that praise for the constitution was tantamount to "academic heresy" in some circles. But he was equally surprised that many people with whom he shared his ideas had a deep knowledge of Iraq but seemed to be vulnerable to groupthink. He heard repeated critiques about the inability of the central government to tax, that the regions were on the verge of gaining independence, and that the provisions were vague. Some had hoped that future amendments would provide some clarity.

کی تشریح کے مسلسل ارتقاء کا تصور دیا ہے: سماجی اور سیاسی تبدیلی ناگزیر ہے، اور نئے اور پرانے سیاسی بندوبست میں تبدیلی کے ساتھ چلنے کے لئے آئین کی زبان لچک دار ہونی چاہیے۔ اگر حمودی صاحب کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ آئین سب سیاسی رجحانات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو مل کر چلنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اسے سیاسی ثقافت اور "عوامی مقبولیت" کا دھیان رکھنا ہے جو آقائے سیستانی نے کرشماتی طور پر عوام کو ووٹ دینے پر آمادہ کر کے تخلیق کی تھی۔ مثال کے طور پر برقعے پر پابندی کی قرارداد نہایت غیر مقبول ہوگی۔ چنانچہ حمودی صاحب کہتے ہیں کہ یہ زبان مکالمے کی ایسی فضاء فراہم کرتی ہے جو مباحث کو عراق کی مقبول آوازوں سے ہم آہنگ کر سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ سوچنا چاہیے کہ اگر مسودہ لچکدار نہ ہوتا تو ایسی صورت میں کیا ہوتا؟ اول تو اس میں ہر انتخابات کے بعد ترامیم ہوتی رہتیں، دوسرے ریاست میں مذہب کے مقام کے تعین کے بارے میں مستقل تعطل جاری رہتا۔

حمودی صاحب کی آئینی فہم ہمیں آقائے سیستانی کی طرف سے آئین کی تیاری اور اس میں مذہب کے کردار پر خاموش رہنے کی حکمت سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ آقائے سیستانی نے دفعات تجویز نہ کر کے آئین کی جزئیات میں مداخلت کرنے سے پرہیز کیا لیکن اس کلی قاعدے کو واضح انداز میں بیان کیا کہ میثاق میں اسلامی اصولوں کو شامل کیا جائے۔ حمودی صاحب نے ہی 2009ء میں مراجع سے ملاقاتوں کے بعد ان کے بیانیے کو "نجف منترا" کا نام دیا جس سے مراد اقتدار کی سیاست میں حصہ لئے بنا شہریوں کی رہنمائی کا عزم تھا۔ چنانچہ یہ قابل فہم تھا کہ آقائے سیستانی سیاسی عمل کی کلیات کے

بارے میں تو متعدد فتاویٰ جاری کر کے اپنے سیاسی موقف کی وضاحت کریں لیکن "سیاسی عمل کی جزئیات" میں مداخلت نہ کریں۔

ریاست میں مذہب کے کردار کے بارے میں آقائے سیستانی کے فتاویٰ کو اکٹھا کر کے ہم اس موضوع پر ان کے موقف کو سمجھ سکتے ہیں، جو اس عمل کے آغاز سے پہلے بھی دیئے جا چکے تھے۔ 2003ء میں انہوں نے ایک ایسے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ حکومت جو "اکثریت کی مرضی" سے منتخب ہوگی اسے اکثریت کے مذہب کا احترام کرنا ہی ہوگا اور وہ "عوام کی لگائی گئی قیود کے خلاف نہیں کرے گی۔" اگلا سوال عراق کو درپیش سب سے بڑے خطرے کے بارے میں تھا، آقائے سیستانی نے کہا "اس کی ثقافتی شناخت، جو اسلام کے ارکان میں سے ہے، کے مٹ جانے کا خطرہ"۔ [۱]

دوسرے سوالات میں آقائے سیستانی سے پوچھا گیا تھا کہ کیا حکومت ایرانی طرز کی ہوگی اور کیا یہ "اسلامی خلافت" ہوگی؟ انہوں نے کہا کہ ایرانی طرز کی حکومتِ فقیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن انہوں نے واضح کیا کہ حکومت کو "اسلام کا احترام" کرنا ہوگا کیوں کہ یہ اکثریت کا مذہب ہے۔ [۲]

---

[۱]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 33۔

Sistani response to Washington Post questions, June 20, 2003.

[۲]۔ اما تشكيل حكومة دينية على اساس فكرة ولاية الفقيه المطلقة فليس وارداً [النصوص الصادرہ، صفحہ 47]۔

Sistani response to Japan Times questions, July 28, 2003.

اسی فتوے میں انہوں نے کہا کہ حکومت کو اسلامی تعلیمات کے منافی کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ کوئی نظامِ حکومت مسلط نہیں کر سکتے اور اس کا فیصلہ عوامی آراء کی روشنی میں ہوگا جو عام انتخابات کے ذریعے ظاہر ہوں گی۔ ان کے نزدیک ان کی ذمہ داری "ان (عوامی آراء کے اظہار) کے لئے راستہ ہموار کرنا" ہے۔ [1]

آقائے سیستانی مذہب کے کردار کو معاشرے کی اخلاقی بنیاد کے طور پر دیکھ رہے تھے لیکن یہ بتانے سے گریز کر رہے تھے کہ اس میں کیا کچھ شامل ہے۔

2003ء میں مجوزہ مجلس قانون ساز کے بارے میں ان کے فتوے کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ قابض قوت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انتخابات کرائے بغیر اراکین کو تعینات کرے۔ لیکن اس میں اس تشویش کا اظہار بھی شامل تھا کہ یہ دستور عراق کی "قومی شناخت" کا مظہر نہیں ہوگا، جسے آقائے سیستانی "مذہب کا اہم رکن اور مقدس سماجی قدر" قرار دیتے تھے۔ [2]

---

[1] ۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 71،72۔

Sistani response to Polish Weekly questions, September 26, 2003.

[2] ۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 35،36۔

Sistani's position first appeared in the "democratic fatwa," June 26, 2003. He offered similar statements during the constitution-writing process.

ان سے سوال کیا گیا کہ وہ اسلامی فقہ کے کن نکات کو آئین کے حصے کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ آئین میں "دینی عقائد، اخلاقی اصول اور سماجی اقدار بنیادی ستون ہونے چاہئیں"۔ [۱]

مستقبل کے آئین میں مذہب کے کردار کے بارے میں ایک بے لاگ سوال نے آقائے سیستانی سے یہ جواب پایا کہ تفصیلات طے کرنا منتخب اسمبلی کے اراکین کا کام ہے۔ [۲]

وہ اکثر اس بات کا اضافہ کرتے تھے کہ "اسلام عراقی عوام کی اکثریت کا مذہب ہے۔اگر آئین کی تدوین عراقیوں کے منتخب کردہ افراد کے ہاتھوں ہوگی تو یہ اسلامی اقدار اور اعتدال پسندی کا مظہر ہوگا"۔ [۳]

اگرچہ وہ مذہب کے کردار کے بارے میں رائے دیتے تھے لیکن اس کے

---

[۱]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 55۔

Sistani response to Indian Pioneer questions, August 14, 2003. He repeated this exact phrase on several other occasions.

[۲]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 78۔

Sistani response to Fox News questions, October 23, 2003.

[۳]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 79،80۔

Sistani response to Washington Post questions, October 23, 2003. Sistani offered an almost identical response to Al-Youm, November 9, 2003.

ساتھ اس ضمانت کا اضافہ کر کے تعادل پیدا کرتے کہ آزاد اور شفاف انتخابات اس مسئلے پر عراقی رائے عامہ کو آشکار کریں گے۔ آقائے سیستانی نے اس بات کا اضافہ بھی کیا کہ آئین کو مفاہمت، تکثریت، دوسروں کی رائے کا احترام اور مساوات جیسے اصولوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ آقائے سیستانی نے ریاست کی نوع کے بارے میں اپنے تصور پر 12 فروری 2004ء میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے زور دیا کہ نظامِ حکومت کا فیصلہ جمہور کی رائے پر چھوڑنا چاہیے۔ انہوں نے اضافہ کیا کہ جو لوگ اس عمل میں ذمہ داریاں اٹھائیں انہیں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنانا چاہیے اور تکثریت، بیلٹ باکس کے احترام، اور پرامن منتقلیٔ اقتدار کے ساتھ ساتھ انصاف اور مساوات کے اصولوں پر متفق ہونا چاہیے۔ [۱]

انہوں نے اپنے مقلدین کو یقین دلایا کہ عراق کی ”اصلی سیاسی اور سماجی قوتیں“ ملا راج کے نفاذ کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کے بجائے وہ ایسی حکومت کے قیام کے داعی تھے جو عراقیوں کی اکثریت کے ”مذہبی عقائد کا احترام“ کرتی ہو۔ [۲]

یہ ایک ایسی سیکولر حکومت کی حمایت تھی جو اسلام سے رہنمائی لیتی ہو اور

---

[۱]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 55، 56۔

Sistani response to Al-Zaman questions, August 15, 2003.

[۲]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 96 تا 99۔

Sistani response to Al-Maktabeh, February 12, 2004. Sistani's response to Der Spiegel questions is similar, February 15, 2004.

معاشرے میں اس کے ثقافتی کردار کا تحفظ کرتی ہو۔

اپنے شروع کے بیانات میں جس چیز کی طرف آقائے سیستانی کی توجہ نہیں تھی وہ یہ تھی کہ عراقی گورننگ کونسل اور عبوری انتظامی دستور آگے چل کر آئین نویسی کے عمل کی سیاسی حرکیات کا تعین کریں گے۔ انہوں نے ایسے عمل کا تصور پیش کیا تھا جو آبادی کی زیادہ بہتر نمائندگی کر سکے۔

آقائے سیستانی کے فتاویٰ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی شرائط پر جمہوریت کی بنیاد رکھنے کے لئے پرعزم تھے۔ ان کے فتاویٰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیعہ اکثریت کو باقی آبادی کی قیمت پر مضبوط نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک مذہبی ریاست نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ ریاست میں تحول کے دوران عراق "ثقافتی شناخت" نہ "کھو" بیٹھیں۔ ہم ماضی میں جا کر تاریخ میں آقائے سیستانی کے کردار کا نمونہ 1906ء میں ایران میں آنے والے جمہوری انقلاب کے دوران اس وقت کے شیعہ مراجع کے جمہوریت کی حمایت کرنے میں دیکھ سکتے ہیں۔ جیسا کہ محقق جناب بابک رحیمی نے کہا ہے، آقائے سیستانی کو اس روایت کا امین سمجھنا چاہیے جس میں مرجع عوام کی رہنمائی کر کے اسلامی اقدار کی ترویج کے ذریعے حکومت اور عوام کے درمیان ایک سماجی معاہدہ قائم کرتا ہے [۱]۔ تاہم اس سے زیادہ بھی ہو رہا تھا۔

---

[۱]۔ Babak Rahimi, "Ayatollah Sistani and the Democratization of Post-Baʿathist Iraq," United States Institute of Peace Special Report 187 (June 2007): 8–9.

آقائے سیستانی کا حقوق اور آزادیوں کے احترام کا تصور جس دور میں تشکیل پایا تھا وہ ان کے پیشروؤں کے زمانے سے مختلف تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے اقدامات ماضی کے مراجع کے فتاویٰ کو مدنظر رکھ کر اٹھائے گئے تھے۔لیکن ان کا خود ارادیت کا تصور جدید خیالات کی روشنی میں بنا تھا، جیسا کہ ان کا اقوام متحدہ کے فیصلوں کی پابندی کرنے اور اس (بین الاقوامی حسبیہ کے) ادارے اور اس کی دستاویزات کی طرف رجوع سے ظاہر ہوتا ہے۔ بہر حال یہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کی اکیسویں شق ہی تھی جس میں واضح انداز میں کہا گیا تھا کہ سب لوگوں کو اپنے ملک کی حکمرانی میں حصہ لینے اور اپنے نمائندوں کو آزادی سے منتخب کرنے کا حق حاصل ہے [۱]۔ اقوام متحدہ کے التزام نے آقائے سیستانی کی بہت مدد کی۔آقائے سیستانی بار بار اقوام متحدہ کا حوالہ دیتے۔اور اقوام متحدہ نے جواب میں عراق کے سرنوشت ساز مراحل میں ان کو ہی واحد موثر آواز کے طور پر قبول کرلیا۔

آقائے سیستانی کے نظریۂ جمہوریت میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ ثقافتی سندیت کے گرد قائم تھا۔اس سے ظاہر ہوا کہ بہت سے اسلامی رہنماؤں کی سوچ جناب مارک جیرگنز میر کے قریب تھی جو مذہب کو قوم سازی اور ریاست سازی کے عمل کی سیاسی مقبولیت کے لئے مفید نظام الاعتقاد سمجھتے ہیں۔انہوں نے اسلام کو ایک جدید اور

[۱]۔ For the language on the Universal Declaration of Human Rights, see the United Nations website: www.un.org/en/universal- declaration-human-rights.

مقبول طریقۂ اظہار کے طور پر لیا ہے جو جدید قومی ریاستوں پر مشتمل سیاسی منظر نامے میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ قدیم مذہبی روایت اور سیکولر قوم سازی کا امتزاج تھا جو آقائے سیستانی کی صورت میں سامنے آیا، جو مارک جیر گنز میر صاحب کے تجزیے کے مطابق جدید قومی ریاستوں میں جمہوری اقدار اور انسانی حقوق کی تقویت کا سبب بن سکتا ہے [۱]۔ جب آقائے سیستانی اسلام کے احترام کی بات کرتے ہیں اور حکومت کو "اسلامی اصولوں کی مخالفت نہ کرنے" کی نصیحت کرتے ہیں [۲]، تو کچھ محققین اس کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن آئینی عمل میں لچک کے مفہوم کی طرف توجہ دینے سے آقائے سیستانی کی اسلام اور جمہوری سوچ میں گہرا تعلق پیدا کرنے کی خواہش کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں ریاست سازی کا عمل جنگ عظیم اول کے بعد عالمی طاقتوں کی سرپرستی میں شروع ہوا جس میں جنگ عظیم دوم کے دوران مزید مداخلت ہوئی۔ قیادت، آئین کی تدوین اور پارلیمانی عمل میں برطانیہ اور فرانس اس سے پہلے کردار ادا کر چکے تھے۔ آقائے سیستانی کی کوشش یہ تھی کہ نو آبادیاتی دور کے اسلوب کو دہرایا نہ جائے، چنانچہ انہوں نے اپنے نظریۂ جمہوریت کو عراق کی مقامی بنیادوں پر تعمیر کیا۔

---

[۱]۔ Mark Juergensmeyer, The New Cold War? Religious Nationalism Confronts the Secular State (Berkeley: University of California Press, 1994).

[۲]۔ النصوص الصادرہ، صفحہ 47۔

Sistani response to Japanese Times questions, July 28, 2003.

جمہوریت کے حق میں

آقائے سیستانی کے فتاویٰ

النصوص الصادرة
عن سماحة السيد السيستاني دام ظله
في المسألة العراقية

إعداد
حامد الخفاف

دار المؤرخ العربي
بيروت - لبنان

رقم: ٧

أسئلة وكالة الأسوشييتد برس

بسم الله الرحمن الرحيم

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

أرجو من سماحتكم الإجابة على الأسئلة المدونة أدناه ونحن لكم من الشاكرين والسلام عليكم

باسم حلمي مروة
مراسل وكالة أنباء أسوشيتد برس الأمريكية

س١: ما هي الحكومة التي تريدون في عراق ما بعد صدام حسين وكيف يجب أن يتم تشكيلها؟ هل ستلعبون دوراً فيها؟

ج١: شكل نظام الحكم في العراق يحدّده الشعب العراقي وآلية ذلك أن تجري انتخابات عامة لكي يختار كل عراقي من يمثّله في مجلس تأسيسي لكتابة الدستور، ثم يطرح الدستور الذي يقرّه هذا المجلس على الشعب للتصويت عليه، والمرجعية لا تمارس دوراً في السلطة والحكم.

س٢: هل تريدون من أبناء الطائفة الشيعية الكريمة أن يتعاونوا مع الإدارة المدنية الأميركية في العراق؟

ج٢: الذي نريده هو أن يفسح المجال لتشكيل حكومة منبعثة من إرادة الشعب العراقي بجميع طوائفه وأعراقه.

س٣: هل تحاول إيران أن تلعب دوراً سياسياً في العراق حالياً وهل حاول الإيرانيون الاتصال بكم؟

ج٣: يفترض بجميع الحكومات أن تحترم سيادة العراق وإرادة شعبه

ولا تتدخل في شؤونهم، وليس لدينا اتصال بأية جهة أجنبية فيما يخصّ الشأن العراقي.

س٤ : هل أبناء الطائفة الشيعية الكريمة موحدون في العراق حالياً وكيف هي العلاقة مع المراجع الأخرى؟

ج٤ : العراقيون بجميع طوائفهم ومذاهبهم، من الشيعة وغيرهم، موحدون في المطالبة باحترام إرادتهم في تقرير مصيرهم ورفض أن يخطط الأجنبي لمستقبلهم السياسي أو الاقتصادي أو الاجتماعي أو الثقافي.

مكتب السيد السيستاني (دام ظله)
النجف الأشرف

رقم: ١٤

استفتاء حول آلية تشكيل المجلس الدستوري

بسم الله الرحمن الرحيم

سماحة سيدنا ومرجعنا المفدى آية الله العظمى السيد علي الحسيني السيستاني (دام ظله).

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد،

أعلنت سلطات الاحتلال في العراق أنها قررت تشكيل مجلس لكتابة الدستور العراقي القادم، وأنها ستعيّن أعضاء هذا المجلس بالمشاورة مع الجهات السياسية والاجتماعية في البلد، ثم تطرح الدستور الذي يقرّه المجلس للتصويت عليه في استفتاء شعبي عام.

نرجو التفضل ببيان الموقف الشرعي من هذا المشروع وما يجب على المؤمنين أن يقوموا به في قضية إعداد الدستور العراقي.

جمع من المؤمنين
٢٠/ربيع الآخر/١٤٢٤هـ

بسمه تعالى

إن تلك السلطات لا تتمتع بأيّة صلاحية في تعيين أعضاء مجلس كتابة الدستور، كما لا ضمان أن يضع هذا المجلس دستوراً يطابق المصالح العليا للشعب العراقي ويعبّر عن هويته الوطنية التي من ركائزها الأساس الدين الإسلامي الحنيف والقيم الاجتماعية النبيلة، فالمشروع المذكور غير مقبول من أساسه، ولا بد أولاً من إجراء انتخابات عامة لكي يختار كل عراقي مؤهل للانتخاب من يمثّله في مجلس تأسيسي لكتابة الدستور، ثم يجري التصويت العام على الدستور الذي يقرّه هذا المجلس، وعلى المؤمنين كافة

المطالبة بتحقيق هذا الأمر المهم والمساهمة في إنجازه على أحسن وجه، أخذ الله تبارك وتعالى بأيدي الجميع إلى ما فيه الخير والصلاح والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

٢٥/ع٢/١٤٢٤هـ
علي الحسيني السيستاني

رقم: ۲۲

أسئلة جريدة الإقتصاد اليابانية

بسم الله الرحمن الرحيم

س١ : ما هو رأي سماحتكم حول المجلس الإنتقالي؟ هل تعتقدون أن المجلس غير مؤهل؟

ج١ : سماحة السيد المرجع لم يعلّق بشيء حول هذا المجلس، وإنما أبدى نظره حول مجلس كتابة الدستور وهو ضرورة إجراء الإنتخابات العامة لاختيار أعضائه من قبل الشعب مباشرة.

س٢ : ما هو رأيكم بالحكم الجديد في العراق؟هل تؤيدون الحكم الإسلامي؟ هل تحبون أن تكون دولة العراق مثل دولة إيران الإسلامية؟

ج٢: أمّا تشكيل حكومة دينية على أساس فكرة ولاية الفقيه المطلقة فليس وارداً، ولكن يفترض بالحكم الجديد أن يحترم الدين الإسلامي الذي هو دين أغلبية الشعب العراقي ولا يقرّ ما يخالف تعاليم الاسلام.

س٣ : إنّ الجيش الياباني المؤلف من ١٣٠٠ جندي يكون في العراق في الشهر العاشر؟ ما هو رأيكم به؟

ج٣: يمكن أن ينظر الشعب العراقي إلى قدومهم بإيجابية إذا تمّ تحت مظلة الأمم المتحدة ولغرض توفير الظروف الملائمة لإجراء الإنتخابات العامة لتشكيل المجلس المكلّف بكتابة الدستور.

س٤ : ما هي العلاقة بين الحكومة المؤقتة وبينكم هل تتلقون الدعم منهم؟ أم ماذا؟

ج٤: لا علاقة بيننا وبين السلطة المؤقتة، وأمّا الحكومة المؤقتة فلم تتشكل بعد.

٢٨/ج١/١٤٢٤هـ
مكتب السيد السيستاني (دام ظله)
النجف الأشرف